جمہوریت کا فریب

مغربی جمہوریت کا جو چربہ ہماری سیاسی اشرافیہ نے پاکستان میں نافذ کر رکھا ہے اسے عوام نے یہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا کہ اس سے ان کے مسائل حل ہو جائیں گے اور دینی حلقوں نے اس لیے قبول کر لیا تھا کہ اس سے ریاستی قوت سے معاشرے کو اسلامی بنانے میں مدد ملے گی لیکن افسوس کہ ان میں سے کوئی امید بھی پوری نہیں ہوئی اور حالات اس حد تک بگڑ چکے ہیں کہ معاشرہ ڈوبنے اور ریاست ٹوٹنے کے کنارے آ پہنچی ہے۔ اللہ ہمیں اس نکبت سے بچائے، آمین۔

اس صورت حال سے نکلنے کا حل کیا ہے؟ بعض لوگ مایوسی کا اظہار کرتے ہیں لیکن یہ رویہ غلط بھی ہے اور نقصان دہ بھی کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا آدمی اپنے اللہ سے بھی مایوس ہے، اسے اپنی فکری صلاحیتوں پر بھی اعتماد نہیں اور مایوسی قوت عمل کو بھی شل کر دیتی ہے۔

بظاہر بچنے کی تین صورتیں نظر آتی ہیں:

ایک: وہ سیاسی اور دینی جماعتیں جو اس ایک ایجنڈے پر جمع ہو سکیں کہ ''پاکستان کو امریکی و بھارتی غلامی سے نکالا جائے'' متحد ہو کر انتخابات میں حصہ لیں اور کامیاب ہو جائیں۔

دوسرے: اگر فوج اور عدلیہ کو بھی سیاستدانوں کے رویے سے ملک و معاشرے کو پہنچنے والے لامتناہی نقصان کا احساس ہو تو جب کیئر ٹیکر گورنمنٹ آ جائے تو دینی اور سیاسی جماعتوں کا مذکورہ متحدہ محاذ سپریم کورٹ چلا جائے اور متعینہ اصلاحات کے لیے کیئر ٹیکر گورنمنٹ کو ایک سال کی مہلت دلوائی جائے تا کہ سیاست کا گند صاف ہو سکے۔

تیسرے: مذکورہ 'متحدہ محاذ سول نافرمانی کی تحریک چلائے' اسے عوامی قوت سے کامیاب کرائے اور ملک کے آئین اور اداروں میں انقلابی تبدیلیاں لائے۔

ہم سر دست تفصیل میں جانے کی بجائے اس اجمال پر اکتفا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے پاکستان اور اس کے نظریے کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

فکر و نظر مدیر

ایک سپر پاور کے ٹوٹنے کی ابتداء —— ہماری بلا سے

ہمارے ایک دوست مجلس میں آئے تو بہت خوش تھے''بیس امریکی ریاستوں نے علیحدگی کا مطالبہ کر دیا ہے۔امریکہ کے ٹوٹنے کی ابتداء ہوگئی ہے''۔ہم نے کہا'میاں! ہماری بلا سے —— روس ٹوٹے امریکہ آئے،امریکہ ٹوٹے چین آئے،چین جائے جرمنی آئے یا کوئی اور؟ ہمیں کیا؟

ہماری دلچسپی اس میں ہے کہ کیا کوئی مسلم ملک اوپر آرہا ہے؟ کیا مسلمان متحد ہوکر ایک بڑی طاقت بن گئے ہیں؟ کیا اسلام کے غالب آنے کا امکان پیدا ہوگیا ہے؟ ہمارا تو وہی بُرا حال ہے جو کل تھا! ہمارے حکمران کل بھی غیروں کے گماشتے تھے،آج بھی ہیں؟ ہمارا نظام تعلیم اور میڈیا کل بھی غیروں کا پیروکار تھا،آج بھی ہے۔ہمارے دانشور کل سوشلزم سے متاثر تھے،آج سیکولرزم کے دلدادہ ہیں،کل کسی اور سپر پاور کے کسی اور ازم کے پیروکار ہوں گے؟ ہمیں کیا؟ ہمارے دن تو اس وقت بدلیں گے جب ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہوں گے،جب ہم اپنے نظریۂ حیات سے وابستہ ہوں گے،جب ہم اپنے دین سے سچے ہوں گے۔

ہم جب تک نہیں بدلیں گے،ہمارے دن نہیں بدلیں گے۔ہمارے خواص بگڑے ہوئے ہیں،امیر مال مست ہیں،علماء حال مست اور عوام بے حس ہیں۔تبدیلی کیسے آئے؟ کہاں سے آئے اور کون لائے؟

لیس للانسان الا ما سعی ''انسان کو وہی ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے''(قرآن حکیم)

جو کھٹکھٹاتا ہے،دروازہ اس کے لیے کھولا جاتا ہے۔جو ڈھونڈتا ہے،وہ پاتا ہے۔(تورات)

آج ہم اپنی نقالی،سستی،کاہلی،کام چوری،غربت،گندگی،منافقت،ضد بازی،انتشار،تضاد اور فرقہ واریت کے سبب''زندہ''قوم نہیں''لنڈا''قوم ہیں۔

حل: قرآن کی بنیاد پر مکمل یکساں مفت تعلیمی اور عدالتی نظام (صدر سے چپراسی تک اور سپاہی سے جرنیل تک)

(ڈاکٹر انعام اللہ،اٹک)

تفہیم دین

ڈاکٹر محمد امین

قصہ احمد جاوید اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا

اصلاحِ فرد اور غلبۂ دین میں توازن کے حوالے سے ایک اہم بحث

احمد جاوید صاحب ہمارے عہد کے ایک بڑے آدمی ہیں [۱] اور ہماری (یعنی مسلم) روایت میں بڑے آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ خود کو بڑا آدمی نہیں سمجھتا بلکہ جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو وہ برملا تسلیم کر کے اس سے رجوع کر لیتا ہے [۲] چنانچہ جمعہ ۱۴ دسمبر ۲۰۱۲ء کی تربیتی نشست میں (ہر جمعہ کو احمد جاوید صاحب کے ہاں بعد نماز مغرب ایک تربیتی نشست ہوتی ہے جس میں اصلاح و تزکیہ کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوتی ہے) انہوں نے کہا کہ میں برسوں سے ان اصلاحی مجالس میں عام طور پر تزکیۂ نفس کے دو اہم تقاضے بیان کرتا رہا ہوں: ایک ذوقِ عبادت اور دوسرے حسنِ معاشرت۔ پہلے کا تعلق انسان اور اس کے رب کے درمیان تعلق سے ہے اور جب تک آدمی میں وہ ذوق عبادت پیدا نہ ہو جائے جس کا عملی مظاہرہ ہم نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں دیکھتے ہیں کہ ساری ساری رات کھڑے رہ کر پاؤں مبارک سوج جاتے تھے اور آپ ﷺ اتنا روتے تھے کہ سینے سے ہانڈی اُبلنے کی آواز آتی تھی اور فرماتے تھے کہ مومن وہ ہے جس کا دل مسجد میں اٹکا رہے۔ ایک نماز سے فارغ ہو تو دوسری کا انتظار کرے کہ کب دوبارہ محبوب سے ملاقات ہو گی۔ اور حسنِ معاشرت کا تعلق انسان اور بندوں کے درمیان تعلق سے ہے اور جب تک انسانوں کے درمیان اس درجے کی اخوت و محبت نہ ہو کہ ماں باپ کی خدمت جہاد سے افضل ہو اور بیوی کو محبت سے لقمہ کھلانا کارِ ثواب ہو اور اللہ کا محبوب پیغمبر (ﷺ) فرمائے کہ وہ مومن نہیں

۱۔ اور ہم یہ اس لیے نہیں کہہ رہے کہ وہ ہمارے مربی ہیں اور ہم ان سے عقیدت مندانہ غلو کے جذبات رکھتے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم انہیں قریب سے جانتے ہیں اور اکثر لوگ انہیں نہیں جانتے۔ اور احمد جاوید صاحب کی یہ خواہش بھی نہیں کہ لوگ انہیں جانیں اور وہ مشہور ہو جائیں۔ وہ چند مہینے ایک دو پروگراموں میں جیو ٹی وی پر آئے اور جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ اس سے باز آ گئے۔ ہم نے البرہان میں ان کے ملفوظات بطور مضامین شائع کرنا شروع کیے تو ان کے نام سے پہلے ''علامہ'' کا لفظ، ان سے بغیر پوچھے، لکھنا شروع کر دیا۔ اس پر وہ ناراض ہوئے اور ہم نے وہ لاحقہ ترک کر دیا۔

۲۔ یہ بات بھی ہمیں کافی دیر سے سمجھ میں آئی۔ جب ہم نے ان میں بعض خامیاں دیکھیں تو ہمیں بطور مسترشد سخت مایوسی ہوئی اور بات قطع ارادت و تعلقات تک جا پہنچی لیکن جب ہم نے اپنا احتساب کیا اور اپنی حاجتِ اصلاح پر نظر ڈالی تو ہمیں اپنے معاشرے میں دور دور تک کوئی ایسا فرد نظر نہ آیا جو ہمارے اسلاف اور محقق صوفیاء کے اسلوب تزکیہ کا تربیت یافتہ اور دوسروں کا تزکیہ کرنے کے ان کا اسلوب کا حامل و شناور ہو اور ساتھ ہی جدید نفسیات و فلسفہ میں مہارت اور نفس انسانی کی پیچیدگیوں کی تفہیم پر قدرت رکھتا ہو اور پچھلی کئی صدیوں سے تصوف میں در آنے والی خلافِ شریعت رسوم و رواج کا بھی تارک اور دین کا اچھا عالم ہو تو ہم نے اپنی غلطی تسلیم کر کے ان سے رجوع کر لیا کیونکہ مربی کو معصوم عن الخطا سمجھنا ایک اصولی غلطی ہے۔ معصوم عن الخطا تو صرف نبی ہوتا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو اسے دوسروں کے لیے ماڈل بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے، اس لیے وحی کے ذریعے اس کی باقاعدہ نگہداشت کی جاتی ہے اور ذرا بھی چھوٹی موٹی کوتاہی ہو تو اس کی فوراً اصلاح کر دی جاتی ہے۔

جس کا ہمسایہ بھوکا سوئے اور وہ خود سیر ہوکر کھائے، اُس وقت تک انسان کا تزکیہ کیسے ہوسکتا ہے۔

احمد جاوید صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں آج تسلیم کرتا ہوں کہ میرا یہ اسلوبِ بیان ناقص تھا اور اس میں ایک تیسرے نکتے کا اضافہ کرنا چاہیے اور وہ ہے جذبۂ انقلاب یا جذبۂ جہاد اور میری اس ترمیم کی محرک بنی ہے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی فکر — اور وہ بھی ان کے انتقال کے بعد۔ رحمة الله عليه رحمةً واسعةً۔ انہوں نے کہا کہ میری ڈاکٹر صاحب مرحوم سے ان کی زندگی میں کئی ملاقاتیں ہوئیں اور ڈاکٹر صاحب کی خواہش و کوشش تھی کہ میں ان کی تنظیم میں شامل ہوجاؤں لیکن ان کی خدمتِ قرآن کی قدر دانی کے باوجود ان کی تحریکی فکر سے ہمیشہ مجھے اختلاف رہا اور جس طرح وہ اقامت دین کی اپنی تعبیر کو پورا دین بنا کر پیش کرتے تھے، اس سے مَیں کبھی اتفاق نہ کرسکا — اور نہ آج کرتا ہوں — لیکن مَیں ان کی للّٰہیت، اخلاص اور دینی حمیت کا قائل ہوگیا اور غالبًا یہ ان کی للّٰہیت ہی کی قوت ہے جس نے ان کی وفات کے بعد بھی، مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے۔[1] اور اب مَیں یہ کہہ رہا ہوں کہ غلبۂ دین اور جذبۂ جہاد بھی تزکیۂ نفس کے پروگرام کا ایک حصہ ہونا چاہیے اور اسے بھی تزکیۂ نفس کا ایک ضروری تقاضا سمجھا جانا چاہیے۔

احمد جاوید صاحب کی بات ختم ہوئی۔ انہوں نے جس طرف توجہ دی اور دلائی ہے، الحمدللہ! ہم پہلے سے اس کے قائل اور مبلغ ہیں جس کے گواہ البرہان کے پہلے شمارے سے لے کر (جس میں اس کی پالیسی بیان ہوئی تھی) اس کے آج تک کے شمارے اور ہماری اُس سے ماقبل کی متعدد کتابیں اور تحریریں ہیں لہٰذا اس پہ کسی تبصرے اور تائید کی ضرورت ہم محسوس نہیں کرتے، البتہ دوگزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں: ایک احمد جاوید صاحب کی خدمت میں اور دوسری ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کے جانشینوں اور متوسلین کی خدمت میں۔

احمد جاوید صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ ان سے بہتر کون جانتا ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ جو متوازن شخصیت پیدا کرنا چاہتے ہیں، اس کی تفصیلات قرآن و سنت کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں اور اس کا بہترین نمونہ ہمارے پاس رسول کریم ﷺ کی ذات مبارک اور آپ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ کی صورت میں موجود ہے لہٰذا اصولی اور کتابی حد تک ہمیں گو ہر مقصود حاصل ہے۔ اصل مسئلہ ہی یہ ہے کہ آج ایسی شخصیت کیسے تیار کی جائے جو ذوقِ عبادت، حسنِ معاشرت اور غلبۂ دین کے کاموں میں مطلوبہ حسنِ توازن کا نمونہ ہو؟ جو چند متلاشیانِ حق احمد جاوید صاحب تک پہنچیں گے وہ ان تک اپنی بات پہنچا دیں گے اور ان کا ذہن صاف کردیں گے لیکن جس جذبۂ انقلاب و جہاد یا غلبۂ دین کو وہ تزکیہ کے نصاب میں شامل کرنے جارہے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ اس متوازن فکر کو عام کیا جائے اور اس کو اجتماعی شکل دی جائے تاکہ مطلوبہ متوازن شخصیت کے حامل افراد تیار ہونے لگیں۔ اس کے ذرائع اور

۱۔ ممکن ہے اس میں کچھ کردار رشید ارشد صاحب کا بھی ہو جو ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کے بھتیجے ہیں اور جناب احمد جاوید صاحب سے پرجوش اصلاحی تعلق رکھتے ہیں۔

تقاضے بہت سے ہیں لیکن ہم ان پر گفتگو کو مؤخر کرتے ہوئے سر دست اس کی پہلی اور ابتدائی (لیکن بنیادی) صورت کو لیتے ہیں اور وہ یہ کہ ایسے تعلیمی و تربیتی ادارے قائم کیے جائیں جو اس طرح کی متوازن شخصیت پیدا کریں۔ لہٰذا ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے مسترشدین کو متوجہ کریں کہ وہ تعلیم و تربیت کے کام میں بھی ہاتھ ڈالیں اور مناسب سمجھیں تو ہم جیسے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیں جو اس ضمن میں مقدور بھر کوشش کرنے کی دیرینہ تمنا رکھتے ہیں۔

دوسری گزارش ہمیں ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کے جانشینوں اور متوسلین سے کرنی ہے کہ جس طرح احمد جاوید صاحب نے ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کے مؤقف کو بعد از وفات تسلیم کرتے ہوئے اپنے تصور تزکیہ پر نظر ثانی کر کے جذبۂ انقلاب و جہاد اور غلبۂ دین کو اپنے نصاب تزکیہ میں شامل کرنے کا اعلان کیا ہے اسی طرح وہ بھی ہمت کریں اور 'اقامت دین' کی ایک خاص تعبیر کو پورا دین سمجھنے اور اس کے لیے بھی خود کو ایک مخصوص طریق کار تک (اسے منہج انقلاب نبوی کی واحد صحیح تعبیر گردانتے ہوئے) محدود کر لینے کے مؤقف پر نظر ثانی کریں[1] اور تزکیۂ نفس، اصلاح معاشرہ اور ذوق عبادت پر تزکیز کو اپنے پروگرام کا حصہ بنا لیں اور اس کے لیے دیگر اقدامات کے ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت (یعنی موجودہ نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح اور نئے تعلیمی اداروں کے قیام) کا راستہ بھی اختیار کریں تا کہ وہ متوازن شخصیت وجود میں آ سکے جو بقول احمد جاوید صاحب ذوقِ عبادت، حسنِ معاشرت اور جذبۂ جہاد و انقلاب اور غلبۂ دین) کی قائل بلکہ اس پر عامل ہو۔

ظاہر ہے نظریات اہم ہوتے ہیں افراد نہیں لیکن ہم نے ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کے مؤقف کے حوالے سے جناب احمد جاوید کی گفتگو کو اس تناظر میں زیر بحث لانا مناسب سمجھا کہ اس حوالے سے ہم دین کے متوازن تصور اور اپنے اس مؤقف کو آگے بڑھا سکیں کہ عصر حاضر میں ذہن سازی کے دوسرے ذرائع کے ساتھ ساتھ نظام تعلیم و تربیت بھی بہت اہم کردار ادا کرتا ہے لہٰذا پاکستان کے موجودہ غیر اسلامی نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کے صحیح، متوازن اور اسلامی تصور پر مبنی تعلیمی و تربیتی ادارے قائم کرنا آج کی بہت اہم ضرورت ہے اور اس سے اہمال مقاصد دین کے لیے نقصان دہ ہے۔

اللہ کرے ہماری اس کوشش سے فہم دین میں افراط و تفریط کے اس منہج سے بچنے کی راہ ہموار ہو سکے جو ایک طرف تزکیہ و تصوف اور اصلاح فرد کے نام پر معاشرے و ریاست کی اصلاح اور اس کے اسلامی کردار کی اہمیت سے صرفِ نظر کرتا ہے تو دوسری طرف جدید اسلامی تحریکوں کو اسلامی انقلاب، جہاد اور غلبۂ دین کے نام پر فرد کی تعلیم و تربیت، تزکیۂ نفس اور ذوق عبادت سے غفلت کی طرف لے جاتا ہے

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

۱۔ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کا مؤقف معروف ہے اور وہ یہ کہ وہ مولانا مودودیؒ کے تصور اقامت دین کے مؤید بلکہ علمبردار ہیں جس کی رو سے دین کا ہدف اور مرکزی نقطہ یہ ہے کہ ریاستی قوت سے دین کو معاشرے میں نافذ کیا جائے لیکن اس کے لیے وہ مولانا مرحوم کے اسلامی انقلاب بذریعہ اسلامی جمہوریت و انتخابات کے قائل نہیں بلکہ اسلامی انقلاب بذریعہ عوامی قوت و بیعت اور خلافت کے قائل ہیں۔

جدید تعلیم　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　پروفیسر ملک محمد حسین

معیارِ تعلیم کا قتلِ عام

وطن عزیز میں قتلِ عام کی کئی قسمیں ہیں۔ کراچی میں ٹارگٹ کلنگ کے ذریعے بے گناہ انسانوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ بلوچستان میں اُن معصوم لوگوں کا قتل عام ہو رہا ہے جو بلوچوں کی خدمت کے لیے ملک کے دوسرے حصوں سے وہاں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ بلوچستان ہی میں مسنگ پرسنز کے حوالے سے قتلِ عام کا مکروہ فعل جاری ہے۔ سندھ میں سیاسی مفادات حاصل کرنے کے لیے سندھی سماج کو تقسیم کرنے کا قتل عام طشت از بام ہوا ہے۔ حکومتیں دیانتداری، گڈ گورننس اور عوام کے حقوق کا قتلِ عام کر رہی ہیں۔ ریلوے، پی آئی اے، سٹیل مل اور اسی طرح کے اہم قومی اداروں کے قتل عام کی کہانیاں روز میڈیا پر آ رہی ہیں۔ ریڑھی والا، بازار میں بیٹھا دکاندار، دفتری بابو، تعمیرات کا کام کرنے والا ٹھیکیدار، شہروں قصبوں کی صفائی پر مامور سینٹری ورکرز اور مسیحا کی شکل بنائے ڈاکٹرز اور ان کا معاون عملہ ٹھگوں کے منظم گروہوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں جو پوری قوم کا قتل عام کر رہے ہیں۔ لیکن قتل عام کی ان تمام اقسام کا دائرہ اثر بہت وسیع ہونے کے باوجود اتنا لامحدود نہیں ہے کہ ان کے اثرات وعواقب قوم کی مکمل تباہی پر منتج ہوں۔ قتل عام کی سب سے بڑی اور قبیح صورت تعلیم اور معیارِ تعلیم کا قتل عام ہے۔ یہ قتل عام کی وہ قسم ہے جس کی وجہ سے اقوام صدیوں تک قعر مذلت میں ڈوب جاتی ہیں۔ قتلِ عام کی مذکورہ بالا تمام اقسام پر اگر بریکیں لگائی جائیں تو معاشرہ چند سالوں میں صحت مند ہو سکتا ہے لیکن تعلیم کُشی کے عمل کو روک بھی دیا جائے تو معاشرے کو جو زخم لگ چکے ہوتے ہیں وہ مندمل ہونے میں بیسیوں سال لیتے ہیں۔

یونیورسٹیوں، کالجوں میں سمسٹر سسٹم اس لیے رائج کیا جاتا ہے کہ اس سے معیارِ تعلیم بہتر ہوتا ہے لیکن وطنِ عزیز میں یہ سسٹم معیارِ تعلیم کا بدترین قاتل ثابت ہوا ہے۔ سمسٹر سسٹم کے لیے جو سہولتیں ہونی چاہیں وہ ناپید ہیں۔ اس کے لیے جو تعلیمی ماحول بنانا چاہیے وہ بنایا نہیں جاتا۔ اس کے لیے جو کلاس سائز ہونا چاہیے اس کا خیال نہیں رکھا جاتا اور سب سے بڑھ کر اس کے لیے اساتذہ کرام میں محنت، دیانت اور غیر جانبداری پر مبنی جو کیریکٹر ہونا چاہیے وہ اکثر صورتوں میں نظر نہیں آتا۔ نتیجہ یہ کہ نصاب کے محدود حصوں کی تدریس ہوتی ہے اور ٹیسٹ اُس سے بھی محدود تر حصوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ تفویضات (Assignments) محدود اور لائبریری کا استعمال نہ ہونے کے برابر۔ نتیجہ بہت اونچا گریڈ پوائنٹ ایوریج (CGPA) اور بہت گرا ہوا علمی تحصیلی معیار۔ سرکاری یونیورسٹیاں اس طرح کے قتل عام کا شاہ کار ہیں تو پرائیویٹ یونیورسٹیاں اُن سے بڑا شاہ کار کہ پرائیویٹ یونیورسٹیوں کا ہدف پیسہ ہے علم نہیں۔

کیسے کیسے نامور تجار جہالت کی تجارت فرما رہے ہیں اور کیسے کیسے نامور پروفیسرز، ڈاکٹرز اور سابق وائس چانسلر زان تاجروں کے بزنس ہاؤسز کے منشی بنے بیٹھے ہیں۔ یونیورسٹیاں اداروں کو (Affiliation) تو دیا ہی کرتی تھیں اب آگے بڑھ کر فرنچائز کیمپس (Franchise Campus) بھی دینے کی شروعات ہوگئی ہیں۔ کچھ سال پہلے بارانی زرعی یونیورسٹی راولپنڈی نے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ اور انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی کے نام سے فرنچائز دیا تھا جس کے ذریعے ہزاروں کی تعداد میں بی۔ایڈ، ایم ایڈ اور ایم۔اے، ایم سی ایس کی ڈگریوں اور سینکڑوں کی تعداد میں ایم فل اور پی۔ایچ ڈی کی ڈگریوں کا جمعہ بازار لگایا گیا۔ اب دیگر نامور یونیوسٹیاں بھی اس بزنس میں آرہی ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو یونیورسٹیاں خود اپنے کیمپسز پر معیارِ تعلیم کی نگرانی نہیں کر سکتیں وہ فرنچائز کیمپسز (Franchise Campuses) پر علم و فضل کی دیکھ بھال کیسے کریں گی جب کہ فرنچائز لینے والوں کی چاہت تو صرف مال کمانا ہوتی ہے۔ الحاقی کالجز کو ٹرم سسٹم کے تحت انڈر گریجوایٹ، گریجوایٹ، اور پوسٹ گریجوایٹ کلاسز کے لیے اجازت دی گئی ہے۔ یونیورسٹی اتھارٹیز کا دعوٰی یہ ہے کہ کوالٹی آف ایجوکیشن کی سخت نگرانی کی جائے گی۔ یہ ان یونیورسٹی اتھارٹیز کا دعوٰی ہے جن کو اپنے اندرونی امتحانات کے پرچوں، تفویضات اور مارکنگ کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ تعلیم میں استاد کا کیریکٹر اور انٹگریٹی (Integrity) واحد عامل ہے جو تعلیمی معیار اور تعلیمی عدل وانصاف کو یقینی بناتا ہے لیکن صد افسوس کہ میرے ہم پیشہ بہنوں بھائیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ان حوالوں سے قابلِ رشک کیفیت میں نہیں ہے۔ پچھلے دنوں میری ایک شاگردہ کی والدہ تشریف لائیں تھیں۔ ان کی بیٹی کے انٹرمیڈیٹ میں بہت اچھے نمبر تھے اور کسی بھی یونیورسٹی میں بی۔ایس آنرز کے کسی بھی مضمون میں اُسے داخلہ حاصل کرنا مشکل نہیں تھا لیکن موصوفہ جو مشکل لے کر میرے پاس آئیں اُس نے مجھے شرمندگی سے پانی پانی کر دیا۔ کہنے لگیں میرے ایک پڑوسی کی ہونہار بچی ایک سرکاری یونیورسٹی میں بی۔ایس آنرز میں پڑھ رہی ہے اُس نے میری بیٹی کو بتایا کہ بی۔ایس آنرز میں بھلے داخلہ لے لو اگر تمھیں اپنے نوجوان ٹیچرز کے پیچھے پیچھے بھاگنے، خوشامد کرنے اور میٹھی میٹھی باتیں کر کے گریڈ لینے کا حوصلہ ہے اور اگر یہ نہیں کر سکتیں تو سمسٹر سسٹم کے تحت کسی یونیورسٹی میں بی۔ایس آنرز کا خیال چھوڑ دو۔ خیر میں نے تو اُس خاتون کو یہ کہہ کر ٹالا کہ یہ سب پروپیگنڈہ اور کہانیاں ہیں اور اس میں کوئی صداقت نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ کہانیاں جھوٹی ہونے کے باوجود اپنے اندر صداقت کا کچھ نہ کچھ عنصر رکھتی ہیں۔

اب آیئے ذرا ثانوی و اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈز کے میٹرک اور انٹر کے امتحانات کی طرف۔ بدقسمتی سے یہ بورڈ امتحانی اور تعلیمی ادارے کم اور فنڈز اور فیسیں اکٹھے کرنے کے ادارے زیادہ بن گئے ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ یہ بورڈ کوئی تاجر اوران پڑھ لوگ نہیں چلاتے ان بورڈز کی تینوں اعلیٰ پوزیشن یعنی چیئرمین ،سیکرٹری اور کنٹرولر امتحانات سینئر اساتذہ اور ماہرین تعلیم کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ بورڈ کے ارکین میں غالب اکثریت سینئر پرنسپل اور ہیڈ ماسٹر صاحبان کی ہوتی ہیں۔ پنجاب بورڈز کمیٹی آف چیئرمین اور انٹر بورڈ کمیٹی آف چیئرمین ملک کے سینئر ترین ماہرین تعلیم پر مشتمل ہیں۔ان اعلیٰ تعلیمی کمیٹیوں اور بورڈز کے پچھلے پچاس سال کے فیصلوں کا مطالعہ کرلیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ شاید ہی کوئی فیصلہ ایسا ہو جس سے تعلیم اور معیارِ تعلیم کی بہتری کی کوئی خوشبو آئے۔ مذکورہ کمیٹیوں اور بورڈز کے اراکین کی غالب اکثریت دیہاتی اور نیم شہری بیک گراونڈ کے ساتھ متوسط اور زیریں متوسط بلکہ زیریں معاشرتی سطح کے خاندانوں کے لائق اور ذہین چشم و چراغ ہیں لیکن اب اُن کا ایک ہی فریضہ ہے کہ متنوع فیسیں لاگو کرکے اور پہلے سے لاگو فیسوں میں اضافہ کرکے غریب والدین کے بچوں کو تعلیم کے راستے پر آنے سے روکیں۔ادھر پنجاب میں خادمِ اعلیٰ کی شکل میں شعبۂ تعلیم پر ایک بلا نازل ہے جو ایک سہولت دے کر دس مصیبتیں کھڑی کر دیتی ہے اور شعبۂ تعلیم کا کروڑوں روپے کا فنڈ اخبارات اور ٹی وی چینلز کے پروپیگنڈے پر لٹا دیتی ہے۔ پنجاب میں امتحانات کے آن لائن سسٹم نے ایک مصیبت کھڑی کی ہوئی ہے جس نے امتحانی نتائج کے اعتبار کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔خرابی شاید اتنی نہ ہوتی ہو لیکن طلبہ میں تشکیک اور بے اعتباری کی سوچ نے اچھے بھلے لائق بچوں کو نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔امتحانی بورڈز کے میٹرک اور انٹر کے امتحانات کے پرچے بالکل غیر معیاری اور بازار میں سستی گِک بکس سے نقل شدہ ہوتے ہیں۔ان پرچہ جات سے حاصل ہونے والے نتائج سائنسی بنیادوں پر کسی طرح جائز اور قابل اعتبار نہیں ہیں۔ رہی سہی کسر میڈیکل اور انجینئرنگ کے انٹری ٹیسٹوں نے نکال دی ہے۔ایسا نظر آتا ہے کہ صرف پیسے کا کھیل ہے جو کھیلا جارہا ہے۔ پیسے والوں کو لوٹا اور غریبوں کو روکا جارہا ہے۔ تعلیمی بورڈز بھی کام کررہے ہیں،انٹری ٹیسٹ لینے والے ادارے بھی پھل پھول رہے ہیں۔ مرکز اور صوبوں میں ایجوکیشنل اسسمنٹ سنٹرز کے نام سے تعلیمی جائزہ و پیمائش کے ادارے بھی موجود ہیں لیکن اب تک اس موضوع پر ایک سٹڈی بھی نہیں آئی کہ بورڈز کے امتحانات کہاں تک درست (Valid) اور قابلِ اعتبار (Reliable) ہیں۔ اور انٹری ٹیسٹ کتنے Valid اور Reliable ہیں۔ بورڈز کے انٹر کے امتحانی نتائج اور انٹری ٹیسٹوں کا کوئی باہمی ربط (Co-relation) ہے بھی یا نہیں؟ نیز طلبہ کی میڈیکل اور انجینئرنگ میں کارکردگی کا ربط اور تعلق بورڈز کے نتائج اور انٹری ٹیسٹوں کے نتائج کے ساتھ کہیں نظر آتا ہے یا نہیں،اس کا ماہرین تعلیم نے کبھی ادراک حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پرائیویٹ سیکٹر میں آغا خاں یونیورسٹی ایگزامینیشن بورڈ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ان کے امتحانی نظام، مارکنگ سسٹم اور نتائج کی بنیاد پر تعلیمی اداروں اور کلاس روم ٹیچر کو فیڈ بیک سسٹم

اِن بلٹ (In-built) شکل میں دیا گیا تھا۔نظر آتا تھا کہ امتحانی نظام کا مقصد محض طلبہ کی تحصیلِ علم کی پیمائش نہیں بلکہ معیارِ تعلیم کو بلند کرنا بھی ہے۔میری معلومات کی حد تک آغا خان یونیورسٹی ایگزامینیشن بورڈ نے ہمارے تعلیمی بورڈ ز کو اپنی مشاورتی خدمات بھی پیش کی تھیں لیکن شاید استفادہ نہیں کیا گیا۔آغا خاں امتحانی بورڈ ز کے چیئر مین ڈاکٹر کرسٹی کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وہ ایجوکیشنل ٹیسٹنگ کا مانا ہوا تعلیمی ماہر ہے اگر ان کے تجربے سے فائدہ اُٹھایا جاتا تو شاید ہمارے تعلیمی بورڈ ز بھی شاہراہِ تعلیم پر درست طریقے سے گامزن ہو جاتے۔

اب رہ گئی سکولوں اور کالجوں کی سطح کی تعلیم تو اُن کا معیار سب کے سامنے ہے۔سرکاری تعلیمی ادارے اپنے بہترین اساتذہ،معقول سے بڑھ کر تعلیمی سہولتوں،مناسب تنخواہوں اور ٹاپ ٹو باٹم (Top to Bottom) مربوط انتظامی ڈھانچے کے باوجود نااہلی اور ناکارکردگی کا شاہ کار ہے۔ٹاپ پر ایک خود پسند لیکن حکمرانوں کا پسندیدہ، بزعم خود ماہر تعلیم، ذہین فطین بیوروکریٹ بیٹھا ہوتا ہے جسے محکمے کا سیکرٹری کہتے ہیں اور باٹم پر مانیٹرنگ سیل کے ریٹائرڈ نائیک اور حوالدار ہیں جنہوں نے تعلیمی اہل کاروں کو اکٹوپس کی طرح اپنے چُنگل میں لے رکھا ہے۔درمیان میں ڈی پی آئی صاحبان سے لے کر ڈی ای او، اے ای او اور پرنسپل، ہیڈ ماسٹر تک سب کا ایک ہی کام ہے کہ درس و تدریس اور تعلیمی نگرانی کو چھوڑ کر ایمرجنسی ای میلز پر آنے والی اوپر کی ہدایات کو نیچے منتقل کریں اور نیچے سے ڈیجیٹل سنیپ (Digital Snaps) تاریخ اور وقت کی ریکارڈنگ کے ساتھ اوپر ارسال کریں اور کنسالیڈیٹ (Consolidate) کر کے سیکشن آفیسر بہادر کو پیش کر دیں جس پر اگر وقت ملے گا تو سیکرٹری بہادر (seen) لکھ کر شرفِ قبولیت بخشیں گے۔

پرائیویٹ سیکنڈری سکول اور کالجز اپنے پروپیگنڈے اور پبلسٹی کی بنیاد پر تعلیمی قتل عام کے ساتھ ساتھ مالی استحصال بھی کر رہے ہیں۔سینکڑوں ہزاروں طلبہ میں سے جو سابقہ امتحان کی بنیاد پر ویسے بھی ٹاپر (Topper) ہوتے ہیں اور ساتھ ہر مضمون کی پرائیویٹ ٹیوشن بھی پڑھتے ہیں کسی نے تو بورڈ، یونیورسٹی میں پوزیشن لینا ہی ہوتی ہے۔اب اس پوزیشن ہولڈر کو ہورڈنگز پر چڑھا کر عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکی جاتی ہے اور ان ہزاروں طلبہ کے ساتھ ہونے والے سلوک کو کوئی نہیں پوچھتا جو میٹرک، انٹر میں 80، 85 فیصد سے زیادہ نمبر لے کر آتے ہیں اور ان پرائیویٹ، پوش (Posh) اور ایئر کنڈیشنڈ کلاس رومز کے حامل کالجوں میں آ کر فیل ہو جاتے ہیں اور اپنا تعلیمی کیریئر ہمیشہ کے لیے ختم کر بیٹھتے ہیں۔امتحانی نظام کی خامیوں کی وجہ سے رٹا بازی، ڈنڈہ بازی، پرچوں کا آؤٹ ہو جانا، بااثر پرائیویٹ کالجز کی امتحانی اہل کاروں سے مفاہمت اور مبینہ طور پر پوزیشنز خریدنے کے واقعات ایک اور ہی کہانی سناتے

ہیں۔ راقم الحروف کو تو اس بات کا زیادہ علم نہیں لیکن بعض باخبر دوست بتاتے ہیں کہ بعض بورڈز اب ادارہ وائز نتیجہ اپنی ویب سائیٹ پرنہیں دیتے اور ایسا بعض بڑے گروپس آف کالجز کی وجہ سے ہو رہا ہے تاکہ ان کا اداراتی نتیجہ عوام کے سامنے نہ آئے۔

پرائمری کی سطح پر حکومت کے تازہ فیصلوں نے مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ سکولوں کا ادغام لڑکیوں اور لڑکوں کی مخلوط تعلیم، انگلش میڈیم اور پہلی جماعت سے انگریزی کی لازمی تعلیم نے رہی سہی کسر بھی نکال دی ہے۔ مانیٹرنگ سیل اور EMIS کی سہولتوں کے باوجود انتظام وانصرام کی صورتِ حال یہ ہے کہ ایک سکول میں 40 طلبہ اور دس اساتذہ ہیں تو دوسرے سکول میں 400 طلبہ اور دو اساتذہ ہیں۔ میں لاہور شہر کے ایک مرکزی گرلز ہائی سکول کو جانتا ہوں جہاں 1800 طالبات ہیں اور ان کو پڑھانے کے لیے صرف 40 استانیاں موجود ہیں۔ ایک این جی او نے از راہِ کرم اپنی کفالت پر پانچ میٹرک پاس استانیاں فراہم کی ہیں جن سے کام چلایا جا رہا ہے۔ مختصر یہ کہ تعلیم کا قتلِ عام جاری ہے۔ اس میں حکومت بھی شریک ہے اور پرائیویٹ سیکٹر بھی۔ بیوروکریسی بھی اپنا حصہ ڈال رہی ہے اور ماہرین تعلیم بھی۔ اساتذہ بھی اپنی تمام تر بے بسی اور مجبوری کے باوصف اس کے ذمہ دار ہیں اور والدین بھی جو آنکھیں بند کیے پروپگنڈے کے آگے یا پیچھے بگٹٹ دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ کیا کوئی ہے جو اس بدترین قتل عام کا نوٹس لے؟

دینی مدارس کا نظامِ تعلیم

ڈاکٹر محمد امین

عصرِ حاضر میں ایک دینی مدرسہ کیسا ہونا چاہیے؟

ضرورت

اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے مبعوث کردہ انبیاء اور خصوصاً آخری نبی حضرت محمد ﷺ کو لوگوں کی اصلاح اور تعلیم کا جو نسخہ بتایا تھا وہ بنیادی طور پر 'تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ پر مشتمل تھا۔ اسی پر آپ ﷺ نے عمل کر کے دکھایا اور اللہ تعالیٰ کی نصرت سے ایسی کامیابی سے فرد اور معاشرے کی اصلاح کی کہ اس سے بڑا انقلاب تاریخ عالم نے شائد کیا یقیناً نہیں دیکھا ہوگا۔ آپ ﷺ کے تیار کردہ صحابہ کرامؓ اور ان کے تیار کردہ اسلاف نے اس نظامِ تعلیم وتربیت کو زندہ رکھا یہاں تک کہ پورا عالم ایک ہزار سال تک اس کی ضوفشانی سے جگمگاتا رہا۔ پھر ہماری کوتاہ بینی اور سیاہ بختی کہ ہم نے اس نسخۂ کیمیا سے استفادہ اور اس پر عمل میں کوتاہی کی اور اس حال کو پہنچے کہ کفار کے غلام ہوئے اور دین ودنیا کی ذلت ورسوائی ہمارے گلے کا طوق بنی۔

اور اب کہ دو تین صدیوں کی غلامی کے بعد لوگوں میں اپنی اصل کی طرف رجوع کرنے کا جذبہ پیدا ہوا ہے اور مسلم فرد اور معاشرے کی اصلاح اور تعمیر نو کا سوچا جانے لگا ہے تو یہ دیکھ کر دکھ اور افسوس ہوتا ہے کہ خواہشِ اصلاح وترقی کے باوجود اس دورِ غلامی نے ذہنوں کو اس طرح تاراج کیا ہے کہ عام لوگ تو رہے ایک طرف خود اہل علم ودانش بھی استعمار کی پیدا کردہ ذہنی فضا سے باہر نہیں آپا رہے۔ اس دوران مسلم قوم کے ایک طبقہ نے تعلیم وتربیت میں مغربی استعمار کے منہج کو اپنالیا جس کی اساس ہی یہ ہے کہ دنیا میں مہذب اور کامیاب زندگی گزارنے کے وہی اصول بہتر اور برتر ہیں جو مغربی استعمار کے ہیں لہٰذا تعلیم و تربیت کے ذریعے ویسا ہی آدمی تیار کرنا چاہیے جو مغربی فکر وتہذیب کو مطلوب ہے۔ بدقسمتی سے عالم اسلام میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً 'آزادی' کے 65 سال گزرنے کے باوجود ہمارا عمومی یا جدید نظام تعلیم ابھی تک مغربیت کی اسی ڈگر پر چلا آرہا ہے اور سوائے معمولی درخ اندوزی (Patch work) کے اس میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں لائی جاسکی۔ ہماری حکومتوں کو اس کی ہوش نہیں اور گو دنیا میں پرائیویٹ سیکٹر منظم ہو کر تعلیم کے شعبے میں کارہائے نمایاں سرانجام دے رہا ہے لیکن ہمارے ہاں کے 'دینی شعور' کو ابھی تک تعلیم کی اہمیت ہی سمجھ میں نہیں آئی اور جن چند لوگوں کی اس طرف توجہ ہوئی انہوں نے بھی اسلام کا نعرہ لگانے کے باوجود وقت کے دھارے کے مطابق ہی تیرنے میں عافیت جانی۔

دوسرا ردعمل یہ ہوا کہ وہ علماء کرام جن کے ہاتھوں میں پچھلے بارہ سو سال سے امت کا نظام تعلیم و

تربیت تھا، انہوں نے جب دیکھا کہ نہ حکومت رہی اور نہ اوقاف تو بھوکے رہ کر اور مسجد کے کچے حجروں میں بیٹھ کر کچھ لوگوں کو دین کی تھوڑی بہت تعلیم دینے لگے کہ مسجدیں تو آباد رہیں اور لوگ نکاح وطلاق کی رسموں سے تو محروم نہ ہو جائیں۔ یہ اُس زمانے کے حالات میں بہت ایثار اور بہادری کا کام تھا اور ہمارے جلیل القدر علماء نے ان مخدوش حالات میں بھی دینی تعلیم کی شمع روشن رکھنے کی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس وقتی اور جزوی کام کو ہی لوگوں نے اصل اور صحیح کام سمجھ لیا۔ طبائع اس سے مانوس ہوگئیں اور اب اس سے ہٹنا اور اپنے اُس اصل کی طرف لوٹ جانا جو دین کا تقاضا اور صدیوں تک اسلاف کا منہج رہا تھا، نامانوس اور مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہو کر رہ گیا ہے اور دینی مدارس کے اکابر بھی اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

ان حالات کی سنگینی کی طرف بڑوں کی توجہ نہ دیکھ کر ہم جیسے اصاغر کو خیال آیا کہ چلو ان بزرگوں کی خدمت میں ادب سے عرض کرتے ہیں کہ جناب والا! وقت بدل گیا، تقاضے بدل گئے اور نظام تعلیم کو دین ودنیا کی اس ثنویت سے نکال کر اسلاف کے منہج پر لانے کی ضرورت ہے لیکن ہم پچھلی ربع صدی سے گویا صحرا میں اذان دیے جا رہے ہیں اور سکولوں کالجوں کے لوگ مغرب کی مرعوبیت سے نکلنے اور دینی مدارس کے لوگ مغرب کے ردِعمل سے نکلنے پر تیار نہیں ـــــ ہم بارگاہ ایزدی میں دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں حق سمجھنے اور کہنے کی توفیق دیے رکھیں کہ نتائج پر نہ ہمارا کنٹرول ہے اور نہ ہماری ذمہ داری۔ تو ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ پچھلے بارہ تیرہ سال سے دینی مدارس سے ہمارا براہ راست رابطہ ہے اور اپنی کتابوں، پمفلٹوں، گفتگوؤں اور پچھلے دو سال سے ماہنامہ البرہان کے ذریعے ہم اہل دینی مدارس تک اپنی آواز پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دینی مدارس کے موجودہ نظام میں کیا کمزوریاں ہیں اور ان میں کیا اصلاح ہو سکتی ہے اور کیسے ہو سکتی ہے؟ اس موضوع پر بھی ہم نہایت ادب سے اپنی گزارشات دینی مدارس کے علماء کرام کے گوش گزار کرتے رہے ہیں۔ بعض بڑے مدارس کو ہم نے خصوصی اصلاحی خاکے بھی بنا کر دیے۔ تاہم حال ہی میں ایک دو صاحبان نے ہمیں توجہ دلائی کہ اس موضوع پر آپ کی متفرق تحریریں بجا لیکن اگر ہم آپ کی تجویز کے مطابق ایک نیا دینی مدرسہ بنانا چاہیں تو کیسے بنائیں؟ آپ ہمیں اس کی پوری اور واضح اسکیم بنا کر دیں تاکہ معاملہ صرف اصولی تجاویز وہدایات تک نہ رہے بلکہ ایک واضح اور مکمل سکیم ہو جس پر عمل کرنے میں دِقت پیش نہ آئے۔ یہ سطور اسی استفسار کے جواب میں لکھی گئی ہیں و باللہ التوفیق۔

بنیادی اصول

پیشتر اس کے کہ ہم مجوزہ نئے دینی مدرسہ کی تعلیمی اسکیم (اسکیم آف سٹڈیز) نصاب، نصابی کتب اور

دیگر تفصیلات کی طرف جائیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان بنیادی اصولوں کا ذکر کر دیں جن پر ہم اپنے مجوزہ تعلیمی ونصابی ڈھانچے کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ان اصولوں کا ذکر اگر چہ ہماری متفرق تحریروں میں موجود ہے لیکن جب یہاں ایک مکمل اسکیم بنا کر دینا مطلوب ہے تو ان کا دوبارہ ذکر ناگزیر ہے۔

یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ پہلے جب ہم دینی مدارس کو اصلاحی تجاویز پیش کرتے تھے تو ان کے ذہن اور ان کی موانست کے پیش نظر اور تدریج کا خیال رکھتے ہوئے یہ کہتے تھے کہ وہ جدید علوم کا تعارفی مطالعہ کرادیں، اپنے نصاب میں کچھ مضامین کا اضافہ کرلیں یا موجودہ مضامین میں کچھ وسعت پیدا کرلیں، میٹرک پاس طلبہ کو داخلہ دیں۔۔۔وغیرہ وغیرہ اور ان کے اس استدلال کو بھی رد نہیں کرتے تھے کہ طب (میڈیکل)، ہندسہ (انجنیئر نگ) اور تجارت (کامرس) کی طرح دینی مدارس بھی دینی علوم کے تخصص کے ادارے ہیں لیکن ہم یہاں اُس سابقہ اپروچ کو چھوڑ کر وحدت تعلیم کے تصور پر ایک مکمل تعلیمی ڈھانچے کی اسکیم پیش کررہے ہیں کیونکہ سچی بات یہ ہے کہ ثنویت کی خامی کے علاوہ دینی مدارس کو اگر تخصص کے ادارے سمجھا جائے تو بھی ان کا موجودہ تعلیمی اور نصابی ڈھانچہ ناقص اور غیر مؤثر ہے اور دینی علوم میں رسوخ اور عصری تقاضوں کے حوالے سے بھی وہ غیر موزوں ہے۔ہم ان الفاظ کے لیے دینی مدارس کے علماء کرام سے معذرت خواہ ہیں۔دینی مدارس پر تنقید ہمارا شیوہ نہیں،ہم تو بس ادب سے کچھ اصلاحی گزارشات ان کی خدمت میں پیش کیا کرتے ہیں کہ وہ ان پر غور فرمالیں۔تاہم اس تحریر کے دوران اگر کوئی ایک آدھ جملہ ایسا نکل جائے جو انہیں ناگوار گزرے تو ہم اس کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہیں۔

اہم مقاصد اور اصول

۱۔ اس تعلیمی اسکیم کا ایک بنیادی مقصد منہجِ نبوی اور منہجِ سلف کے مطابق ایک متوازن مسلمان تیار کرنا ہے جو دنیا وآخرت دونوں کی حسنات سمیٹ سکنے کا اہل ہو۔یوں یہ اسکیم وحدت تعلیم کے تصور کے مطابق تیار کی گئی ہے اور ثنویت کو رد کرتی ہے۔

۲۔ اس اسکیم کا مقصد صرف مسجد اور مدرسے کے لیے علماء تیار کرنا نہیں بلکہ ایسے مسلمان تیار کرنا ہے جو دین کے عالم بھی ہوں اور مسجد ومدرسہ کے علاوہ معاشرے اور ریاست کے مفید کارکن بھی ہوں اور زندگی کے سارے شعبوں میں کامیابی سے کام کرسکیں۔

۳۔ اس میں غیر اسلام (خصوصاً مغربی فکر وتہذیب) سے مرعوبیت ہے اور نہ یہ اس کے ردعمل کی دوسری انتہا پر استوار ہے بلکہ اس میں علوم وفنون کی تدریس، نصابات کی تدوین، اساتذہ وطلبہ کی تربیت کے اسالیب، سب کی تشکیلِ نو اسلامی تناظر میں، وحدت تعلیم کے تصور پر اور عصری تقاضوں کے مطابق کی

جائے گی خواہ اس میں دانتوں پسینہ آجائے۔ تاہم ظاہر ہے کہ یہ کام بٹن دبانے سے نہیں ہوسکتا بلکہ اس میں وقت لگے گا، خصوصاً اس صورت میں کہ حکومتی وسائل سے محرومی اور مادی اور افرادی وسائل کی شدید کمی بھی موجود ہو۔ لیکن ساری مشکلات کے باوجود ہمارا عزم یہ کہ اس بنیادی اصول سے ہم نہیں ہٹیں گے۔ جو اس فکری حریت کا متحمل نہیں اور اس اصول پر عمل نہیں کرسکتا وہ اس اسکیم کو شروع ہی نہ کرے۔

جس کو ہوں جان و دل عزیز　　　اس کی گلی میں جائے کیوں؟

۴۔ ہمیں اس اصول سے بھی اتفاق نہیں کہ نصاب میں علوم وفنون کی پرانی، مشکل اور ادق ترین کتابوں کی بھرمار ہو جس سے تفہیم متاثر ہو اور وہ کتابیں پھر ساری زندگی طالب علم کے کام نہ آئیں سوائے تحقیق کے خوگر چند غیر معمولی ذہین اور محنتی اصحاب علم کے۔ اس کے مقابلے میں ''آسانی سے مشکل کی طرف'' کا اصول زیادہ مفید ہے کیونکہ اس سے فہم حاصل ہوجاتا ہے جو اصل مقصد ہے۔ کلاسیکل کتب ہر علم اور فن کے آخری مرحلے میں پڑھائی جاسکتی ہیں۔

۵۔ ہمیں اس اصول سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ نصاب کا زیادہ تر زور دین کے معاون علوم اور لسانیات پر ہو اور قرآن وحدیث کی ایک آدھ کتاب پڑھادی جائے یا زیادہ پڑھائی جائیں تو رواروی میں، اس طرح کہ نہ اذہان کو صیقل کریں اور نہ قلوب کو زندہ ومتحرک۔ اس کی بجائے قرآن وسنت پر جو اصل دین ہیں، بھرپور توجہ مرکوز کی جائے گی اور وہ بھی اس طرح کہ فہم کے بعد حصول تزکیہ اور تعمیر شخصیت وکردار میں وہ خوب معاون ہوں جو کہ اصل مطلوب ہے (نہ کہ قرآن وسنت کے متون کا مطالعہ اپنے فقہی وکلامی مسلک کی برتری اور فرقہ وارانہ موشگافیوں کے لیے کیا جائے)۔

۶۔ ہماری رائے میں تدریس اردو کو اہمیت دی جانی چاہیے اور وہی ذریعہ تعلیم ہونی چاہیے۔ فارسی کی تعلیم بقدر ضرورت وتفہیم ہو، البتہ عربی اور انگریزی پر خوب توجہ دی جائے اور ان کے سمجھنے، بولنے اور لکھنے (انشاء) پر قدرت انتہائی ضروری ہے، کہ اوّل الذکر کے بغیر دین کے ماخذ نہیں سمجھے جاسکتے اور ثانی الذکر کے بغیر اس فکر وتہذیب کو نہیں سمجھا جاسکتا جو ہمارے عہد میں مسلمانوں اور اسلام کے لیے سب سے بڑا چیلنج، فتنہ اور خطرہ ہے اور جس کی تفہیم کے بعد اسے علمی سطح پر چیلنج اور رد کیے بغیر اسلام کے فکری، علمی اور تہذیبی غلبے کا تصور تو کیا اس کی بقاء واستحکام کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی علوم میں تخصص کے آخری مراحل میں بین الاقوامی (یورپی، روسی، چینی، جاپانی وغیرہ) زبانوں میں سے کسی ایک کی تعلیم بھی لازمی ہونی چاہیے۔

۷۔ مجوزہ مدرسے کا نظام بالعموم وہی ہوگا جو ہمارے ہاں مروج ہے یعنی تدریس، طعام وقیام اور کتب و علاج فری ہوگا البتہ کھاتے پیتے گھرانوں سے آنے والے طلبہ سے توقع ہوگی کہ وہ مدرسہ کے بیت المال

میں اپنا حصہ ڈالیں۔ مدرسہ کی آمدنی کا انحصار اصحاب خیر کے تعاون پر ہوگا۔ مدرسہ کی ایک انتظامیہ کمیٹی اور ایک مشاورتی بورڈ ہوگا۔

۸۔ ہم وحدت تعلیم کے قائل ہیں لیکن ہمارے نزدیک وحدت کا یہ مقصد اس طرح پورا نہیں ہوسکتا کہ موجودہ درس نظامی کے ساتھ معاصر علوم (جیسے کہ وہ ہیں) پڑھا دیے جائیں کیونکہ ہمارا تو بنیادی مؤقف ہی یہ ہے کہ جدید تعلیم مغربیت پر مبنی اور زہر آلود ہے اور ’درس نظامی‘ کے نام پر جو کچھ ہمارے دینی مدارس میں پڑھایا جارہا ہے وہ بھی ناقص اور ناقابل اطمینان ہے لہٰذا دونوں جانب کے نصابات کی اصلاح، تنقیح اور ان میں حکّ واضافوں بلکہ ان کی تشکیل نو کی ضرورت ہے لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ جن حالات میں ہم رہ رہے ہیں کہ ریاست ہماری مؤید نہیں اور جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں معاشرہ بھی اس سے مانوس نہیں لہٰذا اگر طلبہ کو سرکاری ڈگری نہ ملی اور وہ معاشرے اور ریاست کے اداروں میں کھپ نہ سکے تو ہماری اس اسکیم کا ناکام ہوجانا اغلب ہے کہ والدین اور طلبہ رجوع ہی نہیں کریں گے کہ بدقسمتی سے جس عہد پرآشوب میں ہم زندہ ہیں اس میں علم برائے علم یا علم برائے انسان سازی یا علم برائے مسلمان سازی شاید ہی کسی کو مطلوب ہو۔ اس لیے ہماری کڑی آزمائش یہ ہے کہ ہم وحدت تعلیم کا اہتمام بھی کریں، دونوں نظاموں کی موجودہ خامیوں سے بھی بچیں لیکن ڈگری ہمیں بہر حال گورنمنٹ کی منظور شدہ ہی دینا ہوگی۔

ہمارے ذہن میں اس کا نقشہ واضح ہے جس کا اظہار کچھ تو ان سطور میں ہوگا اور کچھ عملاً تجربات سے گزر کر چیزیں مزید واضح ہوں گی لیکن یہ ہماری طے شدہ پالیسی ہے کہ:

- ہمارے طلبہ میں دینی علوم میں گہرا رسوخ پیدا ہو خصوصاً ان طلبہ میں جو علوم اسلامیہ میں تخصص و تحقیق کو اپنائیں گے؛ اور ایک خاص حد تک ان طلبہ میں بھی جو چار سالہ امام وخطیب کی ڈگری لیں گے (تفصیل آگے آرہی ہے)۔
- جو طلبہ عمرانی وسائنسی علوم کی طرف جائیں وہ بھی دین کے اچھے خاصے عالم ہوں۔
- اور سب طلبہ کے تزکیہ وتربیت اور تعمیر سیرت وکردار پر بھرپور توجہ دی جائے۔
- اور ان سب کو حکومت کی منظور شدہ ڈگریاں ملیں تاکہ وہ معاشرے اور ریاست کے اداروں میں کام کر سکیں۔

۹۔ مجوزہ مدرسہ دینی تعلیم کے موجودہ وفاقوں میں سے کسی سے الحاق نہیں کرے گا بلکہ اپنی اور حکومتی ڈگریاں دے گا۔

۱۰۔ مدرسہ کا تعلیمی معیار بہت اُونچا ہو۔ کوالٹی اور کمال (Excellence) اس کا شعار ہو۔

۱۱۔ مدرسہ کی آخری غایت طلبہ کی اسلامی تربیت ہوگی تا کہ ممکن حد تک قرآن کا انسان مطلوب تیار ہو جائے جو متقی اور متوازن شخصیت کا حامل ہو تا کہ دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب ہو سکے۔

۱۲۔ اعلیٰ معیار کی تعلیم اور کردار سازی مدرسہ کی انتظامیہ اور اساتذہ کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داری ہوگی۔ اس بارے میں ان سے باقاعدہ باز پرس ہوگی اور اسی پر ان کی تنخواہ میں سالانہ اضافے اور ترقی کا انحصار ہوگا۔

۱۳۔ نصاب کی تقسیم اس طرح ہے کہ اگر طالب علم کسی مرحلے پر مدرسہ چھوڑ کر جدید تعلیم کے کسی ادارے میں چلا جائے تو اس کا نقصان نہ ہو بلکہ مدرسہ کے اچھے اثرات لے کر وہاں جائے۔

۱۴۔ مجوزہ مدرسہ کا فقہی و کلامی مسلک کچھ بھی ہوسکتا ہے تاہم اس میں مسلک پرستی اور فرقہ وارانہ تشدد نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مدرسہ کا مقصد اچھے عالم اور مسلمان پیدا کرنا ہو نہ کہ اپنے مسلک کے متعصب سپاہی۔ اور اس میں بھی کوئی ہرج نہیں کہ طلبہ اور اساتذہ ایک مسلک کے نہ ہوں کیوں کہ مسلمانوں میں علمی اور فقہی اختلاف کو قاطع اخوت و مودت نہیں ہونا چاہیے اور ان میں اعتدال، رواداری اور برداشت ہونی چاہیے کہ فقہی و کلامی مسالک اجتہاد پر مبنی مکاتب فکر ہیں نہ کہ دین اور مدار حق و باطل ہیں۔

اسکیم آف سٹڈیز (تعلیمی اسکیم کے بنیادی نکات)

۱۔ مجوزہ دینی مدرسے کی تعلیم چھ مراحل پر مشتمل ہوگی جن کی تفصیل یہ ہے:

اولاً: ابتدائیہ (پرائمری)۔ دورانیہ پانچ سال۔ داخلہ کی عمر ۵ سال

ثانیاً: متوسطہ (مڈل)۔ دورانیہ تین سال

ثالثاً: ثانویہ (سیکنڈری سکول)۔ دورانیہ چار سال (موجودہ میٹرک و ایف اے)

رابعاً: عالیہ (موجودہ بی اے آنرز مساوی ایم اے)۔ دورانیہ چار سال

خامساً: عالمیہ: (موجودہ ایم فل)۔ دورانیہ دو سال

سادساً: تحقیق (موجودہ پی ایچ ڈی)۔ دورانیہ تین سال

یہ دورانیہ تقریباً وہی ہے جو اس وقت دنیا بھر میں، عالم عرب میں اور موجودہ پاکستانی نظام تعلیم میں بھی مروج ہے یعنی ۱۲ سال تک ثانویہ کی تعلیم۔ چار سال میں بی اے آنرز اور اگلے دو سال میں ایم فل اور

اس کے بعد تحقیق یعنی پی ایچ ڈی۔ دینی مدارس کا موجودہ نظام بھی اس سے قریب ہی ہے سوائے اس کے کہ یہاں تخصص اور تکمیل کے مراحل ابھی زیادہ منضبط نہیں ہیں۔ پاکستان میں اس سے پہلے ثانویہ (سیکنڈری) میٹرک کو سمجھا جاتا تھا، اعلیٰ ثانویہ یا ہائر سیکنڈری یا انٹرمیڈیٹ ۲ سال کا اور گریجوایشن دو سال کی اور دو سالہ ایم اے گویا کل سولہ سال میں ماسٹرز (ایم اے) اور دینی مدارس کا نظام بھی ایسا ہی تھا کہ وہ مڈل پاس بچہ لیتے تھے اور ثانویہ عامہ، ثانویہ خاصہ، عالیہ اور عالمیہ سارے دو سالوں میں یعنی کل 16 سال میں عالمیہ (مساوی ایم اے) لیکن پاکستانی جب عالم عرب یا امریکہ و یورپ میں حصول تعلیم کے لیے جاتے تھے تو انہیں مشکل پیش آتی تھی اور ان کی ڈگریاں تسلیم نہیں کی جاتی تھیں کیونکہ دنیا میں ہر کہیں ثانویہ ۱۲ سال کا ہوتا ہے پھر چار سال گریجوایشن کے اور دو سال ایم اے کے یعنی کل اٹھارہ سال میں ایم اے۔ پچھلے کچھ سالوں سے پاکستانی حکومت نے بھی بی اے/ بی ایس سی آنرز کو چار سالہ (مساوی ایم اے) قرار دے دیا ہے اور ساتھ ہی پی ایچ ڈی سے پہلے دو سالہ ایم فل لازمی کر دیا ہے تاکہ یوں بی اے ۱۶ سال کا اور ایم اے ۱۸ سال کا ہو جائے جیسا کہ دنیا بھر میں مروج ہے چنانچہ ہم نے بھی اپنی تجویز میں اسی کا خیال رکھا ہے۔

۲۔ اگرچہ ہر مرحلے کے نصابات کی تفصیل آگے آئے گی تو اس سے ہمارے ان تصورات کی وضاحت ہو جائے گی جو ہمارے پیش نظر ہیں لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسکیم آف سٹڈیز میں بھی ان کا مجمل ذکر کر دیا جائے تاکہ قارئین کے ذہن میں ہماری مجوزہ اسکیم کے بارے میں وہ تاثر واضح ہو جائے جو ہمارے پیش نظر ہے (اور موجودہ دینی مدارس کے نظام سے ذرا مختلف ہے):

i۔ درجہ ابتدائیہ اور متوسطہ میں زبانیں سیکھنے اور بنیادی دینی تعلیم کا مرحلہ (بڑی حد تک) مکمل ہو جائے گا۔

ii۔ مرحلہ ثانویہ یعنی ثانویہ عامہ و خاصہ (مروجہ میٹرک و ایف اے) کے چار سال میں اسلامی علوم میں تخصص کا بھی اجراء ہوگا اور دوسرے تخصصات والوں (جیسے میڈیکل، انجنیئرنگ، کامرس وغیرہ) کے لیے بھی علوم اسلامیہ کا اچھا خاصہ حصہ شامل نصاب ہوگا۔ اس مرحلے میں چار گروپ ہوں گے:

۔ ایک گروپ امام و خطیب کی ڈگری لے کر فارغ ہو جائے گا۔

۔ دوسرا گروپ پروفیشنل سائنسی مضامین والوں کا جو میڈیکل، انجنیئرنگ، آئی ٹی، ایگریکلچر وغیرہ میں جا سکتے ہیں۔

۔ تیسرا گروپ عمرانی علوم والوں کا جیسے معاشیات، سیاسیات، قانون، تعلیم، فلسفہ، تاریخ وغیرہ کا۔

۔ چوتھا گروپ جو اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم آگے جاری رکھے گا۔

ان سب کے نصابات میں فرق ہوگا۔ اور گو اسلامی علوم سب پڑھیں گے لیکن ان میں بھی ترکیز (Focus & Weightage) ایک دوسرے سے مختلف اور حسب ضرورت ہوگی۔

iii۔ چار سالہ بی اے آنرز میں اسلامی علوم میں تخصص والے طلبہ اسلامی علوم پڑھیں گے اور عمرانی علوم والے آخری دو سالوں میں متعلقہ عمرانی علم کا بھی مطالعہ کریں گے تاکہ وہ ایم اے (یعنی ایم فل) میں اپنی دلچسپی کا عمرانی مضمون بطور تخصص لے سکیں۔ اس طرح کے طلبہ میں یہ نادر خصوصیت ہوگی کہ وہ بیک وقت انگریزی و عربی مراجع سے استفادہ کر سکنے کی وجہ سے متوازن اور قابل قدر تحقیق کے قابل ہو جائیں گے۔

iv۔ یہی حال مرحلۂ تحقیق (پی ایچ ڈی) کا ہوگا کہ مجوزہ مدرسہ اسلامی علوم میں بھی تحقیق کرائے گا اور عمرانی علوم میں بھی (جن کا تناظر اسلامی ہوگا)۔

v۔ مدرسہ کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ پروفیشنل اور سائنسی مضامین کی تدریس کے ادارے بھی قائم کرے (جیسے میڈیکل و انجنیئرنگ کالج وغیرہ) جو اسلامی تناظر میں کام کریں، پروفیشنل تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلام کی تعلیم بھی ضرورت کی حد تک جاری رہے اور طلبہ کی اسلامی تربیت بھی ہوتی رہے۔ اور یوں مدرسہ روٹین کی اسلامی جامعہ بننے کی بجائے (جس میں صرف قرآن، وحدیث، فقہ، عربی زبان کی تعلیم ہوتی ہے) سچ مچ کی جامعہ بن جائے جس میں دین و دنیا کے سارے اہم شعبوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہو۔ تاہم جب تک یہ نہ ہو سکے عمرانی علوم کی حد تک تو مدرسہ کو ضرور ہی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ان کی تدریس کا انتظام کرے کہ نظریاتی لحاظ سے ان کی اہمیت بھی سائنسی مضامین کے مقابلے میں زیادہ ہے کیونکہ سائنسدانوں اور ٹیکنالوجسٹوں کے مقابلے میں عمرانی علوم کے ماہرین (Social Scientists) جیسے اساتذہ، وکلاء، پروفیسرز، جج اور سیاستدان فرد اور معاشرے کی ذہن سازی میں زیادہ بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔

۳۔ مجوزہ مدرسہ میں گرمیوں اور رمضان کی چھٹیاں نہ ہوں گی البتہ عیدین کے موقع پر دو دو ہفتوں کی اور ہر تین ماہ بعد ایک ہفتے کی چھٹی ہوگی۔ ثانویہ کے بعد کی کلاسوں میں ٹرم سسٹم ہوگا (یعنی ایک سال کا دورانیہ دو حصوں میں تقسیم ہوگا) اور ہر ٹرم کے بعد دس دن کی چھٹیاں ہوں گی۔

۴۔ طلبہ کا یونیفارم پاکستانی لباس پر مشتمل ہوگا۔ اساتذہ گاؤن پہنیں گے۔

۵۔ طالبات کا مدرسہ الگ ہوگا اور ان کا پورا نظام و نصاب بھی ان کی صنفی ضرورتوں کے مطابق ہوگا۔

نصاب

مضمون کوطوالت سے بچانے کی خاطر ہم نے ہر تعلیمی مرحلے کے مقاصدِ تعلیم الگ سے نہیں لکھے جو عموماً آج کل کے نصابات کا حصہ ہوتے ہیں۔اسی طرح نصاب اور نصابی کتب میں فرق بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کیونکہ ترتیب یہی ہے کہ پہلے یہ طے کیا جائے کہ طلبہ کو پڑھانا کیا ہے اور پھر اس کے مطابق کتابیں لکھی جائیں یا موجودہ کتب میں سے کسی کا انتخاب کرلیا جائے۔ یہاں ہم صرف نصاب پر بات کریں گے جس میں یہ بتائیں گے کہ مختلف مراحلِ تعلیم میں کیا پڑھایا جائے گا۔

پرائمری

۱۔ سب سے پہلے بچے کو عربی قاعدہ ایسے قاری سے پڑھایا جائے گا جو ماہر تجوید ہو تاکہ بچے کے مخارج ساری زندگی کے لیے درست ہوجائیں

۲۔ مقامی زبان اگر لکھنے پڑھنے کی زبان کے طور پر مروج ہوتو وہ سکھائی جائے گی بلکہ کوئی ہرج نہیں اگر پرائمری میں وہی ذریعۂ تعلیم بھی ہو۔

۳۔ مقامی زبان اگر لکھنے پڑھنے کی زبان ہوتو اردو تیسری جماعت سے سکھانی شروع کی جائے گی اور اگر ایسا نہ ہوتو اردو پہلی زبان سے شروع کی جائے گی اور وہی ذریعۂ تعلیم ہوگی۔

۴۔ پرائمری میں ناظرہ قرآن مکمل پڑھا دیا جائے گا اور آخری پارہ حفظ کرادیا جائے گا۔

۵۔ نماز اور مسنون دعائیں مع ترجمہ یاد کرائی جائیں گی۔

۶۔ عربی بطور زبان تیسری جماعت سے شروع کی جائے گی لیکن بہت ہلکے پھلکے اور دلچسپ انداز میں تاکہ بچے اوب نہ جائیں۔گردانیں وغیرہ نہیں رٹوائی جائیں گی بلکہ باتصویر قصے کہانیاں، دلچسپ واقعات اور حوار(ڈائیلاگ) کا اسلوب اختیار کیا جائے گا۔ذخیرۂ الفاظ اکثر قرآن حکیم سے لیا جائے گا۔

۷۔ اسلامیات کے نصاب میں ایمانیات پر خصوصی زور دیا جائے گا تاکہ توحید و رسالت اور آخرت جیسے بنیادی عقائد بچے کے دل و دماغ میں راسخ ہوجائیں اور مستقبل میں اس کے کردار کی اساس بن جائیں۔

۸۔ مطالعۂ قرآن و حدیث کا مضمون اس مرحلے میں لازمی ہوگا جس میں قرآن حکیم کے مذکورہ بالا نصاب کے علاوہ ابتدائی تین کلاسوں میں بیس بیس احادیث اور چوتھی پانچویں میں چالیس چالیس احادیث مع ترجمہ وتشریح اور سیرۃ النبی نصاب کا حصہ ہوں گی۔عقائد کے علاوہ عبادات، اخلاق وآداب

اور معاملات سے متعلق احادیث بھی دی جائیں گے۔ ابتدائی جماعتوں کی احادیث نہایت مختصر ہونی چاہئیں تا کہ طلبہ انہیں زبانی یاد بھی کر لیں۔

۹۔ اسلامیات اور مطالعۂ قرآن و حدیث کے نصاب میں بنیادی اسلامی تعلیمات اور حلال و حرام اور اوامر و نواہی کا ذکر آ جائے گا تا کہ خدانخواستہ اگر بچہ پرائمری کے بعد مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکے (پاکستان میں بوجوہ پرائمری کے بعد بچوں کا ڈراپ آؤٹ ریٹ [سکول چھوڑنے کی شرح] بہت زیادہ ہے) تو بھی ضروری دینی معلومات اس کو حاصل ہو جائیں۔

۱۰۔ ابتدائی سطح کا حساب، معاشرتی علوم اور سائنس بھی طلبہ کو پڑھائی جائے گی۔

۱۱۔ بچے نماز باجماعت میں شریک ہوں گے۔ اس طرح وہ وضو اور نماز کا طریقہ بھی سیکھ لیں گے اور اس کے عادی بھی ہو جائیں گے، تاہم پہلے سال اساتذہ اور سینئر طلبہ نرمی اور محبت سے بچوں کا ہاتھ بٹائیں گے اور ان کی مدد کریں گے۔

۱۲۔ ابتدائی جماعتوں میں جب تک بچہ وہ زبان نہ سیکھ لے جو ذریعہ تعلیم ہے اس وقت تک نصاب کو استاد اپنی زبان میں دلچسپ انداز میں پڑھائے گا۔

مرحلہ متوسطہ (مڈل)

۱۔ مطالعہ قرآن و حدیث کے مضمون میں پہلے بیس پارے مع ترجمہ اور چالیس احادیث مع سیرۃ النبی فی کلاس جاری رہیں گی۔ جو بچے قرآن حفظ کرنا چاہیں وہ تین سال کی بجائے پانچ سال میں متوسطہ مکمل کریں گے اور حفظ کے ساتھ دو تین ضروری مضامین بھی پڑھتے رہیں گے اور حفظ کے بعد عام کلاس کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ حفظ میں جسمانی سزا کی ممانعت ہوگی اور قاری کا مجود ہونا لازمی ہوگا۔

۲۔ انگریزی کی تدریس چھٹی جماعت سے شروع ہوگی اور آٹھویں تک اس کا بڑا حصہ مکمل کر لیا جائے گا۔

۳۔ عربی کی تعلیم بھی اس مرحلے میں مکمل کر لی جائے گی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ دونوں زبانوں کا لکھنا پڑھنا، جملے کی بناوٹ اور قواعد کا فہم و استعمال طلبہ کو آ جائے گا۔ ہم یقین سے کہتے ہیں کہ تین سال کے عرصے میں کوئی بھی زبان آسانی سے سیکھی جا سکتی ہے بشرطیکہ مواد تدریس مناسب ہو اور استاد صحیح طریق تدریس سے واقف ہو۔ یہ ظلم ہے اور ناقابل تصور و ناقابل قبول ہے کہ مدرسے میں بچے سارے دورانیہ تعلیم عربی پڑھتے رہتے ہیں اور سکولوں کالجوں میں پہلی جماعت سے لے کر بی اے تک انگریزی لازمی ہے لیکن اس کے باوجود نہ مدرسہ کے طلبہ کو اچھی عربی آتی ہے اور نہ کالجوں کے فارغ التحصیل انگریزی

زبان میں مہارت رکھتے ہیں۔ بعد کے مراحل میں صرف تقریر و انشاء کی مشق اور مطالعۂ ادب ہوگا۔

۴۔ حساب، معاشرتی علوم اور سائنس کے مضامین (اسلامی تناظر میں مدون شدہ) کی تدریس جاری رہے گی۔

۵۔ اسلامیات کا توسیع شدہ نصاب شامل نصاب ہوگا۔

ثانویہ (عامہ و خاصہ) یعنی میٹرک و ایف اے

۱۔ سائنس، کامرس، آرٹس کے ساتھ اسلامی علوم کے تخصص کا گروپ بھی شروع کیا جائے گا۔

۲۔ سارے گروپوں کے لیے مطالعۂ قرآن و حدیث کا مضمون لازمی ہوگا جس میں وہ پہلے دو سال میں ترجمۂ قرآن اور ریاض الصالحین مکمل کرلیں گے

۳۔ اسلامیات کا توسیع شدہ نصاب سب کے زیر مطالعہ رہے گا۔

۴۔ اردو، عربی اور انگریزی تقریر و انشاء کی مشق اور مطالعۂ ادب

۵۔ نویں کلاس میں فارسی کا مطالعہ۔

۶۔ ثانویہ عامہ میں مغربی فکر و تہذیب کا تجزیاتی مطالعہ (مغرب کی فکری تحریکیں، تحریک نشأۃ ثانیہ، تحریک اصلاح مذہب، تحریک تنویر، جدیدیت و مابعد جدیدیت وغیرہ)۔

۷۔ سارے گروپس اپنے اپنے تخصص کے مضامین پڑھیں گے اور ان میں میٹرک کا امتحان دیں گے۔

۸۔ اسلامی گروپ تفسیر، تاریخ، فقہ کا اضافی مطالعہ کرے گا۔

۹۔ بہتر ہوگا کہ مدرسہ بعض مہارتوں (Skills) کا اہتمام کرے (خواہ اس کے لیے سال چھ ماہ مزید لگانے پڑیں) مثلاً الیکٹریشن، موٹر مکینک، کمپیوٹر کمپوزنگ.... وغیرہ تاکہ وہ غریب طلبہ جو میٹرک کے بعد تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے وہ روزی کمانے کے قابل ہو جائیں۔

۱۰۔ ثانویہ خاصہ (ایف اے/ ایف ایس سی) میں سارے گروپ اپنے مضامین پڑھیں گے اور امتحان دیں گے۔

۱۱۔ مطالعۂ قرآن و حدیث میں ایک تفسیر اور علوم القرآن کا تعارف اور حدیث میں مشکوۃ اور سیرۃ النبی شامل نصاب ہوں گی۔

۱۲۔ اسلامیات توسیعی مع تعارف تہذیب اسلامی شامل نصاب ہوگا۔

۱۳۔ اردو، عربی، انگریزی کی تقریر وتحریر اور مطالعۂ ادب شامل نصاب رہے گا اور ہر زبان کے پریڈ میں وہی زبان ذریعۂ تعلیم ہوگی۔

۱۴۔ مغربی تہذیب کے اساسی افکار کا مطالعہ (جیسے ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم، ایمپریسیزم، لبرلزم۔۔۔وغیرہ۔

۱۵۔ سائنس و آرٹس گروپ کے ساتھ مذکورہ اسلامی مضامین کے علاوہ علوم اسلامی گروپ تفسیر، حدیث، فقہ واصول فقہ، ادب، تزکیہ اور تاریخ اسلامی۔۔۔کا اضافی مطالعہ جاری رکھے گا۔

۱۶۔ امام وخطیب گروپ کے طلبہ عمومی واسلامی گروپ کے مطالعہ قرآن وحدیث اور دیگر علوم اسلامیہ کے مطالعہ کے ساتھ ایسے مضامین بھی پڑھیں گے جن میں ان کو نماز روزہ اور عوام کو درپیش روزمرہ کے دینی مسائل کے مطالعہ کا موقع بھی ملے اور تقریر کرنے اور درس قرآن وحدیث دینے کی خصوصی تربیت بھی حاصل ہو جائے۔اس طرح وہ نہ صرف مساجد میں امام وخطیب کے طور پر خدمات انجام دے سکیں گے بلکہ ایف اے کی ڈگری رکھنے کی وجہ سے مزید اعلیٰ تعلیم بھی دوران ملازمت جاری رکھ سکیں گے۔

عالیہ (بی اے آنرز چار سالہ)

۱۔ اگر مدرسہ میڈیکل، انجنیئرنگ اور کامرس کے شعبہ جات کا انتظام خود نہ کر سکا تو ان مضامین کے طلبہ بیرونی کالجوں میں داخلہ لے لیں گے اور اگر مدرسہ نے ان شعبہ جات کا انتظام کیا تو وہ یہ کام اسلامی تناظر میں کرے گا مثلاً میڈیکل میں ایلو پیتھک کے ساتھ طب نبوی، ہومیو پیتھک، یونانی طب اور طب میں مسلمان اطباء کے کردار کا مطالعہ بھی شامل ہوگا۔انجنیئرنگ وتعمیرات میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر بھی شامل ہوگا اور تجارت وبزنس وغیرہ میں اسلامی اصولوں کی بھی باقاعدہ تدریس ہوگی۔

۲۔ پہلے دو سال میں علوم اسلامیہ اور عمرانی علوم کے طلبہ اسلامی علوم کا تخصصی مطالعہ کریں گے یعنی قرآن وحدیث (کتب حدیث وسیرت) فقہ واصول فقہ (تقابلی مطالعہ)، تاریخ، جغرافیہ، اسلامی معاشیات، سیاسیات اسلامی فکر وتہذیب (تقابلی مطالعہ مغربی فکر وتہذیب کے ساتھ)....وغیرہ کا۔

۳۔ آخری دو سالوں میں علوم اسلامیہ گروپ اسلامی علوم کا خصوصی مطالعہ جاری رکھے گا البتہ علوم عمرانیہ گروپ کے طلبہ ان عمرانی علوم کا بھی مطالعہ کریں گے جن میں وہ (ایم فل) میں تخصص کرنا چاہتے ہیں۔ عمرانی علوم، مغربی اور اسلامی تناظر دونوں میں پڑھائے جائیں گے مثلاً مغرب کا سیاسی نظام مغربی مآخذ سے پڑھایا جائے گا تو اسلام کا سیاسی نظام اسلامی مآخذ سے پڑھایا جائے گا۔قانون کے طلبہ اگر

مغربی اور پاکستانی قانون پڑھیں گے تو ساتھ فقہ واصول فقہ بھی پڑھیں گے.....وقس علی ذلک۔

۴۔ اسلام اور مغرب (دور غلامی اور موجودہ حالات) کا مضمون بھی شامل نصاب ہوگا۔

۵۔ ہر مضمون اس کی متعلقہ زبان میں پڑھایا جائے گا مثلاً مغربی معاشیات انگریزی میں اور اسلامی معاشیات (مثلاً کتاب الخراج) عربی میں پڑھائی جائے گی۔

۶۔ مدرسہ ڈگری ایوارڈنگ حیثیت یا کسی پرائیویٹ یونیورسٹی کی فرنچائز لینے کی کوشش کرے گا تاکہ اپنے نصاب کے مطابق امتحان لے سکے۔تاہم جب تک یہ نہیں ہوتا اس وقت تک کسی حکومتی یونیورسٹی سے امتحان دلوا کر ڈگری لی جائے گی اور ساتھ مدرسہ خود امتحان لے کر اپنی ڈگری بھی جاری کرے گا۔اپنے مضامین میں مدرسے کا معیار اتنا بلند ہوگا کہ اس کے طلبہ کے لیے حکومتی یونیورسٹیوں کے امتحان پاس کرنا ذرا بھی مشکل نہ ہوگا۔

۷۔ جولائق طلبہ سول سروسز،جیوڈیشری،ڈیفنس سروسز اور دوسرے اہم شعبوں میں جانا چاہیں گے مدرسہ ان کی حوصلہ افزائی اور معاونت کرے گا۔

عالمیہ/ (ایم فل) دوسالہ تخصص

۱۔ اس میں دوطرح کے تخصص ہوں گے اسلامی علوم میں اور عمرانی علوم میں۔اسلامی علوم میں تخصص کے کئی شعبے ہوں گے جیسے اصول الدین (قرآن و حدیث)،عقیدہ، فقہ و اصول فقہ، اسلامی فکر وتہذیب وغیرہ۔اسلامی علوم میں ان مضامین وموضوعات کی تدریس کو ترجیح دی جائے گی جن کا تعلق معاصر مسلم حالات ومسائل سے ہو۔

۲۔ عمرانی علوم کی تدریس اس طرح ہوگی کہ اس میں پہلے اسلامی نقطۂ نظر پڑھایا جائے گا، پھر مغربی نقطۂ نظر اور پھر دونوں کے درمیان تقابلی مطالعہ۔دونوں میں اصل آخذ سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔

۳۔ طرق تحقیق (اسلامی اور مغربی دونوں) پڑھائے جائیں گے اور ان کے عملی اطلاق اور پریکٹس کے لیے ہر ٹرم میں طلبہ سے ایک مختصر تحقیقی رپورٹ لکھوائی جائے گی تاکہ طلبہ کو تحقیق کی مشق ہوجائے اور عادت پڑ جائے۔

۴۔ اسلامی علوم کے طلبہ کے لیے عربی انگریزی کے علاوہ کسی بین الاقوامی زبان میں مہارت حاصل کرنا ضروری ہوگا۔

تحقیق (پی ایچ ڈی) ۳ سے ۵ سال

۱۔ اسلامی، عمرانی اور سائنسی مضامین کے کسی موضوع پر سیر حاصل تحقیق جس میں اسلامی تصورات کی عصری تطبیق، مغربی فکر وتہذیب کا تنقیدی مطالعہ اور معاصر مسلم معاشرے کو درپیش مسائل کے حل کے حوالے سے نئے آئیڈیاز پیش کیے گئے ہوں۔

۲۔ اس میں داخلہ صرف اس طالب علم کو ملے گا جو عربی وانگریزی میں واضح مہارت رکھتا ہو اور زیر بحث موضوع پر اسلامی اور مغربی آخذ تک رسائی اور تقابلی مطالعے کی صلاحیت بدرجہ اتم رکھتا ہو۔

۳۔ روایتی علمی موضوعات کے علاوہ عصر حاضر میں اسلامی فکر وتہذیب کی معنویت، خصائص، اطلاقات، اسلامی علوم و نصابات کی اسلامی تشکیل نو۔ مسلمانوں کی زوال سے نکلنے کی جدوجہد۔ عصری چیلنجز کا ادراک و جواب۔ مغرب کی ملحدانہ اور سیکولر فکر وتہذیب کی تفہیم اور اس کا تجزیاتی وتنقیدی مطالعہ۔ مسلم فکر و معاشرے پر اس کے اثرات اور ان کا توڑ۔ اسلام اور مغربی فکر وتہذیب کا تقابلی مطالعہ، مغرب کی علمی وفکری برتری کے زعم کو چیلنج کرنا اور علمی وفکری استدلال سے اسلامی اصول واقدار کی برتری کا اثبات جیسے موضوعات پر تحقیق مدرسے کی پالیسی کا حصہ ہوگی۔

نصابی کتب

۱۔ ہر تعلیمی مرحلے کی نصابی کتب کے تعین کا کام ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ پرچہ کے پریس جانے کا وقت سر پہ آ پہنچا۔ لہٰذا یہ تفصیل آئندہ کسی موقع پر پیش کر دی جائے گی، ان شاءاللہ۔ البتہ چند اصولی باتیں اس سلسلے میں عرض خدمت ہیں:

۲۔ مرحلہ ثانویہ تک تو کتابیں متعین ہوں گی لیکن بعد کے تعلیمی مراحل کے لیے نصابی کتب (Text Books) کی بجائے مجوزہ کتب (Recommended Books) ہوں گی یعنی کسی مضمون کی ایک کتاب متعین کرنے کی بجائے استاد اس موضوع پر کئی اچھی کتابوں (یا ان کے ابواب) کے نام تجویز کر دے گا اور خود بھی ان کتابوں، مضامین اور دوسری کتب سے حاصل کردہ علم کی بنیاد پر لیکچر دے گا اور طلبہ ان لیکچرز اور مذکورہ کتابوں کے عمومی مطالعہ کی بنیاد پر امتحان دیں گے۔

۳۔ ذریعۂ تعلیم اور ذریعۂ امتحان اردو ہوگا لیکن جو مضامین اور موضوعات انگریزی یا عربی میں پڑھائے جائیں گے، ثانویہ کے بعد ان کی کتب بھی عربی یا انگریزی میں ہوں گی اور وہ متعلقہ زبان ہی میں پڑھائی جائیں گی اور متعلقہ زبان ہی میں ان کا امتحان ہوگا۔

۴۔ ابتدائی مراحل کے علوم وفنون کی کتب آسان ہوں گی اور اردو میں ہوں گی۔ کلاسیکل اور ادق کتب آخری مرحلے میں پڑھائی جائیں گی۔ ایک امام وخطیب کوفنون کی انتہائی کتب کی اپنے کام میں عموماً ضرورت نہیں پڑتی لہٰذا اسے اس مشقت سے بچا کر اس کی ضرورت کی چیزیں اس کے لیے منتخب کی جائیں گی۔ اسی طرح بلاغہ اور جاہلی شاعری وغیرہ صرف ان طلبہ کو پڑھائی جائے گی جو عربی اسلامیات میں رسوخ حاصل کرنا اور پی ایچ ڈی کرنا چاہتے ہیں لیکن عالیہ اور عالمیہ میں یہ بطور اختیاری مضمون ہوں گے۔

تربیت اساتذہ

۱۔ مدرسہ ہر مرحلۂ تدریس کے لیے ایسے اساتذہ تعینات کرے گا جو اس پیشے کے لیے موزوں صلاحیت اور اس کا شوق رکھتے ہوں۔ معتدل مزاج اور متدین ہوں، فرقہ پرست نہ ہوں۔ اگر ان کا تعلق عمرانی یا سائنسی علوم سے ہو تو بھی دین دار اور سلیم الفطرت ہوں اور اپنے شعبے سے متعلق اسلامی تعلیمات سے باخبر ہوں، نیز مدرسہ کی تعلیمی اسکیم سے متفق ہوں۔

۲۔ مدرسہ اپنے اساتذہ کی تربیت کے لیے مستقل تربیتی پروگرام رکھے گا تاکہ وہ مدرسہ کی تعلیمی اسکیم کو اچھی طرح سمجھ لیں اور خوشدلی سے اسے کامیاب بنانے کے لیے جدوجہد کرنے پر آمادہ ہو جائیں کیونکہ مدرسہ کی نیک نامی اور اچھی کارکردگی کا انحصار اساتذہ پر ہی ہوگا۔ ایک لائق استاد نصاب کی کمی بھی پوری کر سکتا ہے لیکن نصاب اچھا بھی ہو تو ایک غیر موزوں استاد تعلیم کا بیڑا غرق کر سکتا ہے۔

۳۔ مدرسہ کی کوشش ہوگی کہ ہر استاد طلبہ کا خیر خواہ ہو، ان کے ساتھ اولاد کی طرح سلوک کرے، ان کی اسلامی تربیت کے لیے فکرمند ہو اور اس کے لیے خوب محنت کرے۔

۴۔ اساتذہ کو اتنا مشاہرہ ضرور ملنا چاہیے جس سے وہ عزت سے گزر بسر کر سکیں۔

تربیت طلبہ (وہم نصابی سرگرمیاں)

۱۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا مدرسے کی بنیادی غایت صالح علماء و مسلمان تیار کرنا ہے اور تعلیم کتاب وحکمت بھی ایک ذریعہ ہے تزکیۂ نفس کا اور یہ کہ طلبہ کی اسلامی تربیت مدرسہ انتظامیہ و اساتذہ کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داری ہے۔

۲۔ مدرسہ میں ایک تربیت کمیٹی ہوگی جس کا سربراہ مدرسہ کا پرنسپل یا اس کا نامزد کردہ کوئی موزوں استاد ہوگا۔ ہر کلاس کا انچارج استاد اس کمیٹی کا رکن ہوگا۔ ہر کلاس میں ایک نیک اور ذہین لڑکا تربیتی امور میں کلاس انچارج کا نائب ہوگا اور اس کی معاونت کرے گا۔

۳۔ یہ کمیٹی تعلیمی سال کے آغاز میں سارے سال کی تربیتی سرگرمیوں کی منصوبہ بندی کرے گی اور اس کا ٹائم ٹیبل اور لائحہ عمل بنائے گی۔

۴۔ اس کمیٹی کا اجلاس ہر ماہ ایک مقررہ تاریخ کو ہوگا جس میں تربیتی منصوبوں پر عمل درآمد کا جائزہ لیا جائے گا اور مشکلات اور موانع پر غور ہوگا۔ بگڑے طلبہ کی اصلاح کے لیے لائحہ عمل تیار کیا جائے گا۔

۵۔ ہر طالب علم کی ایک فائل بنے گی جس میں اس کے ضروری کوائف درج ہوں گے۔ سال کے آغاز میں ہر طالب علم کے تربیت کے 100 نمبر ہوں گے اخلاقی حسنات پر ان نمبروں میں استاد اضافہ کرتا جائے گا اور اخلاقی کمزوریوں پر نمبر کم ہوتے جائیں گے۔ سال کے آخر میں جس طالب علم کے نمبر کلاس میں سب سے زیادہ ہوں گے اسے انعام ملے گا۔ 90 نمبروں سے کم والا طالب علم فیل متصور ہوگا اور سکول انتظامیہ کی صوابدید ہوگی کہ اسے اگلی کلاس میں ترقی دے یا نہ دے۔ جو طلبہ تربیت میں مدرسہ میں اوّل آئے گا سالانہ تقریب میں اسے خصوصی انعام اور سرٹیفکیٹ دیا جائے گا تاکہ دوسرے طلبہ کی حوصلہ افزائی ہو۔ تربیت کی جانچ کا یہ سسٹم کمپیوٹرائز بھی کیا جاسکتا ہے۔

۶۔ جو طلبہ اخلاقی کمزوریوں میں مبتلا ہوں اور اساتذہ کو ان کی اصلاح میں مشکل پیش آرہی ہو، ان کے والدین کو مدرسہ میں بلا کر ان سے مشاورت کی جائے گی اور ان کی مدد لی جائے گی۔ خصوصی حالات میں طالبعلم کو اسلامی ماہر نفسیات یا ماہر اخلاقیات کے پاس بھجوایا جائے گا جس کا انتظام مدرسہ کی تربیتی کمیٹی کرے گی۔ ایسے طلبہ جو اخلاقی جرائم میں مبتلا ہوں، مدرسہ کا ماحول خراب کررہے ہوں اور اصلاحی اقدامات، تنبیہ وتادیب اور (ناگزیر حالات میں) سزا کے باوجود سنبھلنے پر تیار نہ ہوں انہیں مدرسہ سے خارج کیا جاسکے گا۔

۷۔ تربیت سے مراد صرف معروف اخلاقی تربیت نہیں بلکہ یہ ایک وسیع تر اصطلاح ہے جس میں ایمانی تربیت، اخلاقی تربیت، علمی وفکری تربیت، انتظامی تربیت، معاشی تربیت، جسمانی تربیت اور انسانی صلاحیتوں کا نشو ونما سب شامل ہیں۔ ہر طرح کی تربیت کے لیے تعلیمی وتربیتی سرگرمیوں کی ایک فہرست تربیت کمیٹی مدون کرے گی۔

۸۔ ہم نے جدید تعلیم کے اداروں کے لیے تربیتی سرگرمیوں کی تنظیم کے حوالے سے ایک 'تربیت طلبہ مینوئل' تیار کیا ہے اور اسی طرح تربیتی مباحث اور معاملات میں اساتذہ اور سکول انتظامیہ کی رہنمائی اور مطالعہ کے لیے ایک ''تربیت طلبہ گائیڈ'' تیار کی ہے۔ انہی دونوں کی طرز پر مجوزہ مدرسہ کے لیے بھی تربیتی مینوئل اور تربیتی گائیڈ تیار کی جائے گی، ان شاء اللہ۔

۹۔ وہ سرگرمیاں جنہیں غیر نصابی یا ہم نصابی سرگرمیاں کہا جاتا ہے وہ سب کی سب مذکورہ بالا تربیتی سرگرمیوں میں شامل ہوں گی۔

عارضی اقدامات

اگرچہ اس مدرسہ کے پیش نظر جو مقاصد ہیں وہ اسی وقت پوری طرح حاصل ہوں گے اور جس طرح کی متوازن شخصیت یہ مدرسہ پیدا کرنا چاہتا ہے وہ اپنی مثالی صورت میں اسی وقت وجود میں آئے گی جب اس مدرسے کی پہلی جماعت میں داخلہ لینے والا طالب علم اس مدرسے کے آخری درجے سے فارغ ہوکر نکلے گا جس کے لیے کم از کم ۲۱ سال درکار ہیں۔ جو کوئی اس طرح کا مدرسہ چلانا چاہتا ہے اور اس کے نتائج دیکھنا چاہتا ہے تو اسے اس کسان کے سے صبر کی ضرورت ہے جو درخت لگاتا ہے اور پھل اس کی آئندہ نسل کھاتی ہے۔

تاہم اس صبر اور انتظار کے ساتھ ساتھ یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ کچھ عارضی اور وقتی اقدامات کیے جائیں تاکہ سو فیصد نہ سہی ساٹھ ستر فی صد سہی کچھ نہ کچھ تو نتائج نکلیں اور منتظمین مصروف بھی رہیں۔ اس کی کئی صورتیں ممکن ہیں مثلاً ہم نے مجوزہ مدرسہ کے لیے چھ تعلیمی مراحل تجاویز کیے ہیں تو ان میں سے کئی مراحل پر بیک وقت عمل درآمد شروع کیا جا سکتا ہے یا بعد کے مراحل پر پہلے عمل کی ابتداء کی جا سکتی ہے۔ یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ دینی مدارس کے فضلاء میں دوران تعلیم جو کمی کوتاہی رہ گئی ہے اسے پورا کرنے کے لیے کورسز شروع کروا دیے جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ موجودہ دینی مدارس میں سے جو ہماری اس مجوزہ اسکیم سے اتفاق کریں وہ اپنی سہولت کے مطابق کسی مرحلے سے اضافی کام کی ابتداء کر دیں۔ اس طرح کی دوسری تجاویز پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔

حرفِ آخر

جس طرح کے مدرسے کا خاکہ ہم نے سطور بالا میں کھینچا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح کے دینی مدرسے پاکستان بھر میں قائم ہوں۔ اس سلسلے میں ضروری مشاورت کے لیے ہماری خدمات حاضر ہیں۔ ہم خود بھی اس طرح کا ایک مدرسہ لاہور میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جن اصحاب کو اس حوالے سے دلچسپی ہو وہ البرہان سے رابطہ قائم کریں۔ ہم موجودہ دینی مدارس کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ وہ ہماری گزارشات اور تجاویز پر غور فرمائیں اور اگر ان میں سے کوئی تجویز انہیں مفید اور قابل عمل لگے تو اس پر عمل سے نہ ہچکچائیں کیونکہ عربی ضرب المثل کے مطابق یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا کہہ رہا ہے۔

ہم اہل علم اور اصحاب فکر و نظر کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ نئے دینی مدرسے کے بارے میں ہمارے تصورات و تجاویز کی اصلاح، تنقیح، تجزیے اور نقد کے لیے قلم اٹھائیں، ہم ان کی تحریر کا خیر مقدم کریں گے۔

رپورٹ ملی مجلس شرعی

فحاشی اور اس کا شرعی حکم

سپریم کورٹ آف پاکستان میں اس وقت ایک کیس الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں فحاشی ختم کرنے کے حوالے سے زیر بحث ہے اور قانونی نقطہ یہ پیش نظر ہے کہ دستور پاکستان کی دفعہ ۳۷(G) میں اس حوالے سے Obscene (فحش) کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ اور اس کا اطلاق کن کن امور پر ہوسکتا ہے☆۔ ملی مجلس شرعی نے، جو تمام دینی مکاتب فکر کا ایک مشترکہ علمی پلیٹ فارم ہے ، یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ سپریم کورٹ کے لیے میڈیا میں فحاشی سے متعلق ایک متفقہ رپورٹ تیار کرے۔ چنانچہ یہ رپورٹ تیار کی گئی ہے جو تین حصوں میں منقسم ہے۔

حصہ اوّل: فحاشی کی تعریف، اس کے مختلف مظاہر اور ان کے بارے میں حکم شرعی
حصہ دوم: مغرب میں میڈیا کے بُرے اثرات
حصہ سوم: فحاشی کے خاتمے کے لیے مجلس کی سفارشات

حصہ اوّل: فحاشی کی تعریف، مظاہر اور حکم شرعی

پیشتر اس کے کہ ہم فحاشی کی تعریف کریں اور یہ بتائیں کہ اس سے کیا مراد ہے اور اس کے بارے میں اللہ ورسول نے کیا حکم دیا ہے ہم دو اہم باتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ ہم مسلمان ہیں اور پاکستان ایک مسلم معاشرہ ہے[۱] مسلم عربی زبان میں وہ شخص ہے جو

☆ پوری بات یوں ہے کہ دستور کی دفعہ ۳۷ میں ریاست کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے:

"The promotion of social justice and eradication of social evils."

یعنی ''عدل اجتماعی کو پروان چڑھانا اور سماجی برائیوں کا خاتمہ کرنا، اور اس کی تفصیل کے لیے ذیلی دفعہ ۳۷(G) میں کہا گیا ہے:

"The state shall: Prevent prostitution, gambling and taking of injurious drugs, printing, pbublication, circulation and display of obscence literature and advertisements".

یعنی ''ریاست ختم کرے گی: قحبہ گری کو، جوئے بازی کو، استعمال منشیات کو اور فحاشی کو طباعت، اشاعت، سرکولیشن، ڈسپلے اور تحریر و اشتہارات میں سے۔''

۱) یہاں جو تھوڑے بہت غیر مسلم پائے جاتے ہیں اسلام نے وسعت قلبی سے ان کے حقوق کا تعین کیا ہے (دیکھیے مثلاً سنن ابی داؤد، کتاب الخراج، باب تعشیر اہل الذمۃ) اور مسلم معاشرے اور ریاست کو انہیں ادا کرنے کا سختی سے حکم دیا ہے اور اس کی صراحت دستور پاکستان میں بھی موجود ہے۔ (دیکھیے دفعہ ۳۶)

اسلام قبول کرے اور اس کے احکام پر عمل کرے اور اسلام لغت میں غیر مشروط اطاعت (unconditional submission) کو کہتے ہیں۔ اصطلاحاً اس سے مراد ہے وہ شخص جو اللہ (اور اس کے رسول ﷺ کی [۱]) غیر مشروط اطاعت اپنی مرضی اور خوشدلی [۲] سے کرتا ہے۔ چونکہ انسان کی حیثیت اللہ کے مقابلے میں عبد [۳] کی ہے لہٰذا اسے یہی سزاوار ہے کہ وہ اپنے اللہ (جو اس کا خالق و مالک، رازق و ہادی، اسے نفع ونقصان پہنچانا والا، اسے زندگی اور موت دینے والا اور ایسی ہی دوسری صفات کثیرہ کا مالک ہے) کی خوش دلی سے غیر مشروط عبادت واطاعت کرے تاکہ وہ اس سے راضی ہوجائے اور اللہ کی رضا طلبی ہی ایک مسلمان کی آخری غایت ہوتی ہے [۴]۔ خلاصہ یہ کہ ہر مسلمان (خواہ وہ عام آدمی ہو، حکمران ہو، جج ہو، ٹی وی مالک یا اینکر پرسن ہو، اخبار کا مالک یا صحافی ہو) اللہ اور رسول کے احکام ماننے کا مکلّف اور پابند ہے اور آخرت میں ان کے لیے جوابدہ ہوگا خواہ انسانوں کے بنائے ہوئے کسی دستور میں ان کا ذکر ہو یا نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ مملکت پاکستان کے مسلم نمائندوں نے اپنی ریاست چلانے کے لیے جو آئین بنایا ہے، اس میں اگرچہ انہوں نے کافی کوشش کی ہے کہ وہ قرآن وسنت کے مطابق ہو (مثلاً مملکت کا نام ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' رکھا گیا (دفعہ ۱)۔ یہ کہا گیا کہ اس کا مذہب اسلام ہوگا (دفعہ ۲)۔ یہ تسلیم کیا گیا کہ ''حاکمیت اعلیٰ'' اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور ریاست وحکمران اس کے احکام کی اطاعت کریں گے اور جمہوریت، آزادی وغیرہ کے تصورات پر اسلامی تعلیمات کے مطابق عمل ہوگا اور آزادیٔ اظہار رائے قانون اور اخلاق عامہ کے ماتحت ہوگی (دفعہ ۲A) اور یہ بھی کہا گیا کہ یہاں کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں بن سکتا اور جو بنے ہوئے ہیں ان کو بھی اسلام کے مطابق تبدیل کیا جائے گا (دفعہ ۲۲۷)۔ یہ بھی کہا گیا کہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے اقدامات کرے جو پاکستان کے مسلمانوں کو اسلام کے مطابق زندگی گزارنے میں مدد دیں (دفعہ ۳۱ (1))۔ اس کے لیے قرآن حکیم اور اسلامیات کی لازمی تعلیم اور عربی زبان کے فروغ کا حکم دیا گیا (دفعہ ۳۱ (a)) اسلامی اخلاقیات کی پابندی کا کہا گیا (۳۱ (b)) اور اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے زکوٰۃ، عشر، اوقاف اور مساجد کی تنظیم کا کہا گیا (۳۱ (c))۔ اسی غرض سے

---

۱) کیونکہ رسول اللہ ہی کی طرف سے مبعوث کردہ ہوتا ہے اور اس کی مرضیات کا نمائندہ اور مظہر ہوتا ہے اور قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے بہت دفعہ رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے (دیکھیے مثلاً، المائدہ ۵: ۹۲، النور ۲۴: ۵۴ وغیرہ)

۲) کیونکہ اسلام عقیدے میں جبر کا قائل نہیں ہے، حسب قول سبحانہ وتعالیٰ "لا اکراہ فی الدین" (البقرہ ۲: ۲۵۶)

۳) الذاریات ۵۱: ۵۶

۴) الحدید ۵۷: ۲۷، المائدہ ۵: ۲، وغیرہ

اسلامی نظریاتی کونسل (دفعہ ۲۲۸-۲۳۹) اور وفاقی شرعی عدالت (دفعہ ۲۰۳(A) تا ۲۰۳(J)) قائم کی گئی) مطلب یہ کہ پوری کوشش کی گئی کہ دستور اسلامی ہو، اس کا مزاج اسلامی ہو اور وہ اسلامی تقاضوں کو پورا کرنے والا ہو، لہٰذا ججوں کی ذمہ داری ہے کہ ہر معاملے میں قرآن وسنت کے مطابق حکم دیں، حکمرانوں کا کام ہے کہ اسے نافذ کریں اور عوام کو چاہیے کہ اس پر عمل کریں۔

یہ وضاحت ہم نے اس لیے ضروری سمجھی کہ ہمارا الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا جو فحاشی وعریانی پھیلا رہا ہے اس کو غیر اسلامی اور غیر قانونی قرار دینے کے لیے ہمارا انحصار صرف دستور کی دفعہ (۳۷(g)) میں Obscene کے لفظ پر نہیں ہے جو آئین میں من جملہ دوسری معاشرتی برائیوں کے خاتمے کے لیے استعمال ہوا ہے بلکہ اگر یہ لفظ نہ بھی استعمال ہوتا تو پھر بھی عدالت کو چاہیے تھا کہ وہ فحاشی کو قرآن وسنت کے خلاف ہونے کی بناء پر خلاف دستور قرار دے اور اس کے خاتمے کا حکم دے اور متعلقہ فریقوں پر فرض ہے کہ وہ اسے قرآن وسنت کا فیصلہ سمجھ کر اس پر عمل کریں۔

اس ضروری وضاحت کے بعد آیئے اب فحاشی اور اس کے شرعی حکم کے بارے میں کچھ عرض کرتے ہیں:

اسلام جو معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے جو معاشرتی احکام اس نے دیے ہیں، وہ اوامر و نواہی پر مشتمل ہیں یعنی اس نے کچھ کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور کچھ کاموں کے کرنے سے روکا ہے۔ وہ جن اصول واقدار کو پروان چڑھانا چاہتا ہے وہ یہ ہیں: خاندان کا ادارہ، نکاح کا حکم اور اسے آسان بنانا، حیاء، عفت، پاکیزگی، نسل کی حفاظت، عورتوں کو پردہ کا حکم وغیرہ اور کچھ باتوں سے وہ روکتا ہے جیسے فحاشی، عریانی، گانا بجانا، ناچنا، شرعی حدود و قیود کے بغیر اختلاط مرد وزن، عورتوں کی بے پردگی، نظر بازی (یعنی غیر محرم عورتوں مردوں کا بلاضرورت ایک دوسرے کو دیکھنا، گھورنا) زنا اور مقدمات زنا، شراب پینا اور غل غپاڑہ کرنا، عورتوں کا غیر ضروری فیشن اور اسے غیر مردوں پر نمایاں کرنا......وغیرہ۔

ان میں سے بعض تصورات واصطلاحات بہت جامع ہیں اور اپنے گروپ کی اکثر چیزوں کا احاطہ کرتے ہیں جیسے حیاء وعفت میں اکثر اوامر آجائیں گے اور فحاشی ومقدمات زنا میں اکثر نواہی آجائیں گے۔ یہاں ہم اسلام کے فحاشی کے تصور اور اطلاقات پر روشنی ڈالیں گے آیئے! پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ عربی انگریزی اور اردو ڈکشنریوں میں اس لفظ کے کیا معنی دیے گئے ہیں:

فحاشی

عربی میں اس لفظ کا مادہ ف ح ش ہے، اہل لغت نے اس کے لفظی ولغوی معنی یہ کیے ہیں:

الفحش: القبیح من القول والفعل...... وهو كل مايشتد قبحه من الذنوب والمعاصی ......وکل شیء جاوز قدره وحدّه فهو فاحش (۱)

یعنی فحش سے مراد ہیں برے اقوال وافعال......معاصی اور گناہوں میں سے بدترین......فاحش ہر وہ امر ہے جس میں اس کی حد سے تجاوز ہو۔

جرمن مستشرق ھینز وھر نے اپنی عربی انگریزی ڈکشنری میں فحش اور فحاش کے معانی مندرجہ ذیل کیے ہیں (۲):

فحش: *fahusha u (fuhsh)* to be monstrous; to be excessive, exorbitant; to be detestable, abominable, atrocious, obscene, indecent, foul, shameless, impudent IV to use obscene language; to commit atrocities VI=I and IV.

فحاش: fahhash obscene, lewd, shamelees in speech or action تالیف فحاش porngraphy.

- معروف انگریزی ڈکشنری آکسفورڈ نے Obscene کے مندرجہ ذیل معانی بیان کیے ہیں (۳)

Obscene: 1-highly offensive, morally repugnant, arch. repulsive, foul, loathsome.

2- Offensively or grossly indecent, lewd; Law (of a publication) tending to deprove and corrupt those who are likely to read, see, or hear the contents.

3- ill-omened, inauspicious.

۱- ابن منظور، لسان العرب، الجزء السابع، ص ۳۲، طبع دار الحدیث بالقاہرہ، ۲۰۰۳ء

۲- Hans Wehr, *A Dictionary of Modern Written Arabic*, 3rd Edition, p-698, Macdonald and Evans Ltd. London, 1980.

۳- *The New Shorter Oxford English Dictionary*, vol 2, p-1967, Oxford University Press, 1993.

- مقتدرہ قومی زبان کی قومی انگریزی اردو لغت میں Obscene کے اردو میں مندرجہ ذیل مترادفات دیے گئے ہیں: (۱)

شائستگی یا اخلاق کے مقررہ معیار کے خلاف، ناشائستہ، عریاں تصویروں والا، گفتگو یا عمل میں ناگواری، بدچلنی پر اکسانے اور نفسانی خواہش جگانے پر مائل، شہوت انگیز۔

Obscenity گندا پن، فحش، فحش کیفیت یا خصوصیت، ناشائستگی، کوئی فحش چیز جیسے زبان۔

فحش کیا ہے؟

جیسا کہ ہم نے عربی لغت میں دیکھا کہ لفظ فحش میں دو مفہوم پائے جاتے ہیں: ایک اپنی حد سے آگے بڑھ جانا اور دوسرے قبح یعنی اس کا برا ہونا کیونکہ جس چیز کی جو حد خالق فطرت نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا برائی ہے۔ اگرچہ قرآن حکیم نے رذائل اخلاق کے لیے عدوان (زیادتی) سوء و سیئة (برائی) منکر (ناشناس)، خطا (غیر صحیح) اثم (گناہ) جیسے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں لیکن قوت شہوانیہ یا جنسی جبلت کی تسکین سے متعلق جو حدیں مقرر فرمائی ہیں، ان کو توڑنے اور ان سے آگے بڑھنے کی بری حرکت کو بالعموم فحش (فحشا و فاحشہ) قرار دیا ہے اور اسے شیطانی انگیخت کا نتیجہ قرار دیا ہے، فرمایا:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ امَنُوْا لاَ تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ.... (۲)

اے ایمان والو! شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو اور جو شیطان کے نقشِ قدم پر چلتا ہے تو وہ اسے ہمیشہ فحاشی اور بُرائی کے کام کرنے کو کہتا ہے۔

جنسی جبلت کے غلط اور برے استعمال کا واضح اور بڑا قرینہ زنا (یعنی غیر قانونی جنسی تعلق) ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اسے فاحشہ (بنی اسرائیل ۴:۳۲) یعنی فحاشی اور فاحشہ بینہ (الطلاق ۶۵:۱) یعنی واضح اور بڑی فحاشی قرار دیا ہے۔

سورہ بنی اسرائیل کی مذکورہ آیت جس میں زنا کو فحاشی قرار دیا گیا ہے، وہاں یہ نہیں کہا گیا کہ 'زنا نہ کرو' بلکہ کہا گیا ہے "و لا تقربوا الزنا"، یعنی زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ اس کی تشریح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث سے ہوتی ہے جن میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ زنا صرف حرام جنسی فعل کا نام نہیں بلکہ یہ تو تکمیلی مرحلہ ہے اور ابتدائی مراحل میں جسم کے جو اعضاء بھی اس فحش کام میں معاونت کرتے ہیں

۱- ڈاکٹر جمیل جالبی، قومی انگریزی اردو لغت، صفحہ ۱۳۳۹، طبع ششم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء
۲- النور ۲۴:۲۱

وہ بھی گویا زنا کے کار بد میں حصہ لیتے ہیں(۱) گویا یہ سارے کام بھی فحش ہیں یعنی دماغ سے فحش باتیں سوچنا اور فحش کاموں کی منصوبہ بندی کرنا، زبان سے فحش باتیں کرنا، آنکھوں سے فحش مناظر دیکھنا، کانوں سے فحش باتیں سننا، ہاتھوں اور پاؤں کو فحش کاموں کی خاطر حرکت دینا اور استعمال کرنا وغیرہ۔ ان سب کو رسول اللہ ﷺ نے کانوں کا زنا، آنکھوں کا زنا، ہاتھوں کا زنا قرار دیا ہے اور زنا کو قرآن حکیم نے فحش قرار دیا ہے لہٰذا وہ بھی فحش ہیں چنانچہ سارے جسمانی اعضاء کے خلاف شرعی استعمال کی جو حدیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر کی ہیں انہیں توڑنے یا اس کے لیے جو ہدایات انہوں نے دی ہیں ان کی خلاف ورزی کرنے والے سارے کاموں پر فحش کا اطلاق ہوگا اور انہیں فاشی میں شمار کیا جائے گا۔ ان فحش کاموں کی ناشائستہ اور اخلاق سے گری ہوئی باتوں سے لے کر زنا تک ایک طویل فہرست بنائی جاسکتی ہے لیکن ہم یہاں یہ ترتیب اختیار کریں گے کہ چونکہ قرآن نے زنا کا نام لے کر اسے فحش ترین حرکت قرار دیا ہے اور نبی کریم ﷺ نے زنا تک لے جانے والی بے حیائی کی ساری باتوں اور کاموں کو متعلقہ اعضائے جسمانی کا زنا قرار دے کر انہیں فحش قرار دیا ہے لہٰذا ہم نے فحش کی تفصیلات کے لیے جسمانی اعضاء کے غلط استعمال کو بنیاد بنایا ہے تاکہ ہم جو کہیں وہ قرآن وسنت کی رو سے فحش ہو نہ کہ ہماری یا کسی اور انسان کی رائے میں فحش ہو۔

نظر (دیکھنا)

۱- غض بصر کی مخالفت

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مسلمان مردوں اور عورتوں کو غض بصر یعنی نظریں نیچی رکھنے کا حکم دیا ہے (النور ۲۴: ۳۰،۳۱) اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ غیر محرم کو (شہوت کی نظر سے) دیکھنا آنکھ کا زنا ہے؟(۲) اور یہ بھی فرمایا ہے کہ صرف پہلی نظر جو بلا ارادہ کسی غیر محرم پر پڑ جائے وہ جائز ہے۔ اس کے بعد عمداً کسی غیر محرم (عورت یا مرد) کو دیکھنا اور گھورنا جائز نہیں (۳)۔ (خود نبی کریم ﷺ نے اس میں مخطوبہ کو دیکھنے اور فقہاء نے اس میں ''ضرورت'' کا استثناء کیا ہے جیسے ڈاکٹر کا مریضہ کو دیکھنا خصوصاً جب لیڈی ڈاکٹر موجود نہ ہو اور مرض کے بڑھ جانے اور ہلاکت کا اندیشہ ہو)۔ لہٰذا غیر محرم مرد وعورت کا ایک دوسرے کو بلاضرورت پسندیدگی اور شہوت سے دیکھنا اور دکھانا دونوں کا شمار فحش میں ہوگا اور ڈیجیٹل تصویر (ٹی وی، انٹرنیٹ وغیرہ) کا حکم بھی قیاساً یہی ہوگا۔ (جاری ہے)

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الاستیذان، باب زنی الجوارح
۲- صحیح مسلم، کتاب القدر، باب قدر ابن آدم حظه من الزنی
۳- سنن ترمذی، کتاب الاستیذان، باب ماجاء فی نظرة الفجأة

تزکیۂ نفس

احمد جاوید

دعاء مانگنا سیکھیے (۲)

س: سلسلۂ کلام میں خلل تو پڑے گا مگر دو چیزوں کی وضاحت ہو جائے تو یہ ساری گفتگو زیادہ اچھے طریقے سے سمجھ میں آئے گی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حسنِ تعلق سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اور دوسرے آپ نے یکسوئی کو نفس کا بہت بنیادی تقاضا یا ضرورت بتایا ہے اس کے لیے اگر کوئی شرعی سند پیش کر دی جائے تو بہت مناسب ہوگا؟

ج: آپ انسان کا تجزیہ کرتے چلے جائیں جو جزء سب سے آخر میں بچے گا وہ استعدادِ تعلق ہے، اپنے احساس اور شعور کے ساتھ۔ انسان کی تمام صلاحیتیں اور قوتیں اصل میں اسی جوہر کی تکمیل کے لیے ہیں مثلاً علم، اختیار اور حواس ظاہری وغیرہ۔ ہم کسی چیز کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ محض ذہن کی فہرستِ معلومات میں اضافے کے لیے نہیں کرتے بلکہ اس چیز سے تعلق پیدا کرنے اور اس تعلق کو بامعنی بنانے کے لیے اسے زیادہ سے زیادہ سمجھنے اور جاننے کی کاوش کی جاتی ہے۔ اس بات کو جتنا چاہے پھیلا دیں نتیجہ یہی نکلے گا کہ آدمیوں کے تمام افعال وخیالات وغیرہ حسنِ تعلق کی تسکین اور شعورِ تعلق کی تکمیل کے لیے ہیں۔ یہ انسان ہی ہے جو ہر چیز کو پوری طرح جاننے کا جذبہ رکھتا ہے تاکہ اپنے اور اس چیز کے درمیان فاصلے کو کم کر دے۔ اسی طرح ارادہ واختیار بھی فی الحقیقت اپنے اس ہدف سے قریب ہونے کے لیے ہے۔ علمی انداز میں کہیں تو تعلق کی استعداد دیگر تمام صلاحیتوں کی بنیاد بھی ہے اور ان کا منتہیٰ بھی۔

دینی تناظر میں دیکھیں تو ہمارا سارا علم وعمل اللہ سے اپنے تعلق کو کامل، محکم اور بامعنی کرنے کا ذریعہ ہے۔ ایمان سے لے کر اخلاق واعمال تک ہر شے تعلق باللہ کے مقصود کے حصول کا وسیلہ ہے۔ اسی لیے ہم نے شائد پہلے بھی زور دے کر کہا ہے کہ بندگی ساری کی ساری حسنِ تعلق اور شعورِ تعلق سے وابستہ ہے۔ اس کے باقی تمام اوصاف اسی حسن اور شعور سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی کے کمال پر ختم ہوتے ہیں۔ ایک سامنے کی بات دیکھیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ بندوں کے جن اوصاف کی قدر دانی اور تعریف فرماتے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ ہوگا جس کی اصل تعلق باللہ کا جوہر نہ ہو، مثال کے طور پر صبر، اخلاص، تقویٰ، استقامت، خشیت وغیرہ۔ بندگی اور انسان کی اصل مشترک ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ بندگی کو انسان کی حقیقت قرار دینے کے بعد اللہ تعالیٰ انسان کی عقل کو بندگی سے مختلف بنائیں۔ جو اس کا اصل ہے وہی اس کی اصل بھی ہے یعنی تعلق مع اللہ۔ اب چونکہ یہ تعلق معبود اور عبد، مالک اور غلام اور حاکم ومحکوم کا ہے لہٰذا اس میں حفظ مراتب ضروری ہے یعنی اللہ سے تعلق اللہ کی شان اور اپنی حیثیت کے مطابق۔ دوسرے لفظوں میں تعلق باللہ کی تمام تفصیلات خود اللہ کی طرف سے طے کردہ ہیں اور بندہ اپنی فطرت وخلقت میں ان تفصیلات سے پوری مناسبت رکھتا ہے۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔مقصود صرف اتنا بتانا تھا کہ مطالعۂ انسان کا ہر طریقہ، خواہ غیر دینی ہی کیونکہ نہ ہو، اس بات پر متفق ہے کہ آدمی کی شخصیت میں سب سے پہلی اور گہری بنیاد تعلق ہی ہے۔ اس لیے اس تحقیق کو مسلمات کو درجہ حاصل ہے۔قرآن وحدیث میں قلب اور اس کے اطمینان کا تذکرہ زیادہ تر اس جہت سے آتا ہے کہ ایک سچے بندے کا ذوقِ تعلق جب تسکین پاتا ہے تو اس کا قلب مطمئن ہو جاتا ہے یعنی قلب اس استعداد کا مرکز ہے جس میں علم وعقل، نیت وعمل اور رغبت و رھبت سب یکجا ہیں۔ نمونے کے طور پر چند آیات واحادیث درج کی جاتی ہیں:

آیات: ۔ وَاِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لِاِبْرَاهِيمَ ۔ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ [الصٰفٰت 37:83-84]

''اور نوحؑ کے طریقے پر چلنے والوں میں ایک ابراہیمؑ بھی تھے۔ یاد کرو جب وہ قلبِ تسلیم کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوئے''۔

۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ وَ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ [البقرة 2:7] ''اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے''۔

احادیث :۔ شبہے کے مقامات میں اپنے قلب سے پوچھو

"استفت قلبک، البرّ ما اطمأنت اليه النفس، و اطمأن اليه القلب، و الاثم: ماحاک فی النفس وتردد فی الصدر، وان افتاک الناس و افتوک" (مسند احمد ۲۲۸/۴)

''اپنے دل سے پوچھو۔نیکی وہ ہے جس پر نفس مطمئن ہو اور دل میں کھٹک نہ ہو۔اور گناہ وہ ہے جو نفس میں کھٹکے اور دل میں اس کی بابت تردد ہو، اگرچہ لوگ تجھے (اس کے جواز کا) فتویٰ دے دیں''۔

۔ تقویٰ کا محل قلب ہے

".....الا! وان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله، و اذا فسدت فسد الجسد کله: الا! وهی القلب" (صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینه)

''سنو! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا جسم صحیح ہوتا ہے اور جب وہ خراب ہوتا ہے تو سارا جسم خراب ہوتا ہے اور وہ (ٹکڑا) دل ہے''۔

اب رہا یکسوئی کا معاملہ تو سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یکسوئی کا مطلب ارتکازِ توجہ نہیں ہے بلکہ جمعیتِ ارادہ ہے یعنی اپنے اختیار کی حد تک بندہ مقصود کی طرف رخ کرے اور اس سے انحراف کا کوئی قدم نہ اٹھائے۔ یہ ہے یکسوئی شرعی مفہوم میں اور یہ فرض ہے۔ باقی یکسوئی کا جو تصور بعض حلقوں میں رائج ہے کہ توجہ اس طرح ایک نقطے پر جم جائے کہ اس نقطے کے علاوہ کسی چیز کا ہوش اور دھیان نہ رہے، یہ شرعی معیار سے ایک پست درجے کی چیز ہے اور غیر فطری ہونے کی وجہ سے خطرناک بھی ہے۔ اس میں ایک

عنصر خود فراموشی کا بھی ہوتا ہے جس کی موجودگی میں بندگی ہی ملحوظ نہیں رہتی۔ پھر ایسا مصنوعی ارتکاز آدمی کی بہت سی ضروری صلاحیتوں کو بھی فنا کر دیتا ہے جن کے بغیر بندگی کے بہت سے مطالبات پورے نہیں ہو سکتے۔ ہم اس تصور کو ذرا آگے چل کر تفصیل سے دیکھیں گے۔ سرِ دست یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یکسوئی سے ہماری جو بھی مراد تھی اس کے بنیادی اجزا بھی ساتھ ہی بیان کر دیے گئے تھے، ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ دین میں مطلوب یکسوئی کوئی پراسرار اور غیر طبعی چیز نہیں ہے بلکہ سادہ سی نیت اور معمول کے شعور سے پیدا ہوتی ہے، اور اخلاص، احسان، خشیت، ذکر وغیرہ اس کے ثمرات ہیں۔ اس کا کشف و کرامات اور معارف ومشاہدات سے کوئی تعلق نہیں ہے جنھیں ایک طبقہ اعلیٰ درجے کے دینی و روحانی فضائل سمجھتا ہے۔

س: یکسوئی کا متصوفانہ تصور تو ہمیں کچھ اور بتاتا ہے۔ آپ کی بات اس تصور سے براہ راست متصادم ہے از راہِ کرم اس کی وضاحت ضرور کر دیں کہ اس تصور میں ایسی کون سی قباحتیں ہیں جن کی وجہ سے آپ نے ایک بالکل مخالف پوزیشن اختیار کر لی ہے؟

ج: سب سے پہلے تو اس بات کی وضاحت ہو جانی چاہیے کہ ہم نے جس تصور کو رد کیا ہے اسے عام معنی میں گو کہ متصوفانہ سمجھا جاتا ہے لیکن محقق صوفیاء اس طرح کے تصورات کی تلقین و تبلیغ نہیں کرتے تھے، اس لیے ہماری تنقید کو تصوف پر تنقید سمجھنے کی بجائے یوں دیکھنا چاہیے کہ ایک غلط قسم کا صوفیانہ مزاج اور ذہنیت جس نے دینی طبائع پر خاص غلبہ حاصل کر لیا ہے اس کو ہدف بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اب آتے ہیں اس طرف کہ اس تصور میں جس کی ہم تردید کرنے چلے ہیں، کیا امکانی اور واقعی خرابیاں پائی جاتی ہیں؟ بہتر ہوگا کہ ان خرابیوں کی ایک فہرست بنالی جائے:

۱۔ ارتکازِ توجہ کا جو بھی ہدف ہوگا وہ آدمی کے اپنے ذہن کی پیداوار ہوگا۔ یہاں ارتکازِ توجہ کی اصطلاح ہم ایک فنی اور تکنیکی مفہوم میں استعمال کر رہے ہیں۔ یعنی ذہن میں اپنے موضوع کا احاطہ کرنے کی خلقی صلاحیت پائی جاتی ہے، اسے زور لگا کر کسی ہدف پر اس قصد کے ساتھ مرکوز کر دینا کہ اس ہدف کے علاوہ کچھ بھی معلوم ومحسوس نہ رہے یا بالفاظ دیگر موجود نہ رہے۔ یہ ارتکازِ توجہ کا وہ فلسفہ اور تصور ہے جس پر ہم جرح کر رہے ہیں۔ ایسے ارتکاز کی مشق اپنے معلوم مقاصد کے ساتھ بھی غیر فطری ہے اور اپنے حاصلات کے لحاظ سے بھی غیر ضروری۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس طرح کی مشقوں میں مبتلا ہو جانے والے زندگی کے دیگر شعبوں میں دین کے تابع رہنے کا ضروری معیار بھی ملحوظ نہیں رکھ پاتے۔ دین روحانیت وغیرہ کے نام پر ایک تخیلاتی اور مفروضاتی سطح تک محدود ہو جاتا ہے اور حقائق کی دنیا سے اس کا کوئی قابل ذکر رابطہ نہیں رہ جاتا۔ ایسے لوگ نفسیاتی اصطلاح میں دہری شخصیت کے مالک ہوتے ہیں، ایک شخصیت وہ جو ان کے خیال میں ہوتی ہے اور دوسری وہ جو معاملات وغیرہ میں ظاہر ہوتی ہے۔

۲۔ یکسوئی کو نیت اور ارادے کے دائرے سے نکال کر اسے ذہن کے سپرد کر دینا اللہ کے بارے میں بندے کے بنیادی تصورات کو متاثر کر دیتا ہے۔ جو لوگ یکسوئی کا مطلب ارتکازِ توجہ لیتے ہیں اور اس کے

لیے ریاضتیں کرتے ہیں، وہ بندگی کی اصل پوزیشن پر قائم نہیں رہ پاتے۔ وہ اصل پوزیشن اور حیثیت عبادت، محبت اور اطاعت کی ہے جسے یہ حضرات معرفت کی خواہش میں بدل دیتے ہیں۔ یہ ایک بنیادی بات ہے کہ مثلاً نماز میں ہم اللہ کی معرفت کے مراحل طے نہیں کر رہے ہوتے بلکہ اس کی خوشنودی کے لیے اپنی بندگی کو خالص کر کے اس کی جناب میں پیش کر رہے ہوتے ہیں اور یہ سارا عمل بھی خود معبود کی بتائی ہوئی ظاہری اور باطنی حدود کے اندر رہ کر انجام پاتا ہے۔ اس اصول کو نہ سمجھنے کا نتیجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا کہ بندہ اللہ کی بنائی ہوئی حدود بندگی اور تصور معبود پر قانع نہیں رہتا اور معرفت کے نام پر غیب میں نقب لگانے کی کوششیں کرتا ہے اور ایسے معارف کے حصول کے درپے ہو جاتا ہے جو شریعت نے اشارۃً بھی تعلیم نہیں کیے بلکہ شریعت سے ان کا محال ہونا ہی ثابت ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل لمبی ہے، سر دست اتنا ہی سمجھنا کافی ہے کہ اللہ کی طرف متوجہ ہونے کے فطری تقاضے کی تکمیل اگر محض ذہن کی قوت ارتکاز پر چھوڑ دی جائے تو شعور کی ایمانی ساخت بگڑ کر رہ جاتی ہے اور ارادہ، جو روح بندگی ہے، معطل ہو جاتا ہے۔

۳۔ احسان اللہ کو دیکھنا نہیں ہے بلکہ اس استحضار کا نام ہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ لوگوں نے اس معاملے میں بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ احسان سے مراد اللہ کو دیکھنا ہے جس کے لیے انہوں نے نادیدہ کو دیکھنے والی مختلف پراسراری مشقیں اختیار کر لیں جن میں تخیل کی قوتوں کو ایک خاص رخ پر موڑ دینے کا ہنر سکھایا جاتا تھا یعنی اللہ کو دیکھنے کے لیے اللہ کو فرض کر لینے کی صلاحیت کو پروان چڑھایا گیا اور اس صلاحیت کے نتائج کو معارف و مشاہدات کا نام دے دیا گیا۔ یہ بات خوب غور کے قابل ہے کہ حدیث احسان میں اللہ کو دیکھنے والا حصہ واضح طور پر اللہ کو نہ دیکھ سکنے پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں حکم دوسرے ٹکڑے میں بیان ہوا ہے کہ اللہ کو تم کیا دیکھو گے بس اتنا یقین اپنے اندر حاضر رکھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اس کی تفصیل ہم ان شاءاللہ احسان کے باب میں بیان کریں گے۔

۴۔ یکسوئی کو محض ذہن بنا کر اسے قلبی یا روحانی یکسوئی کا نام دے دینے سے ایک خاص مزاج اور رویہ پیدا ہو جاتا ہے جو عبادت اور بندگی کے شرعی حدود اور ساخت سے بے گانگی رکھتا ہے۔ بندگی کے ہر عمل میں حکم کا تصور موجود رہنا چاہیے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اعمال عبودیت میں اخلاص کی سطح برقرار رہتی ہے۔ جس یکسوئی کو ہم رد کر رہے ہیں وہ ایک پراسرار فضا اور مقام کی حامل ہے جس کے اندر آمادگی کے ساتھ قدم رکھ دینے والا عبودیت اور عبادت کے بعض نامطلوب نتائج، مقاصد اور تصورات میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہ ایک عام خرابی ہے کہ یکسوئی کو شغل بنا کر بندہ ایک لطیف لذت پسندی، کیفیت پرستی اور مشاہدات سازی کے چکر میں پڑ جاتا ہے جس سے اعمال ہی نہیں بلکہ عقائد کی مجموعی فضا وہ نہیں رہتی جو دین میں بنائی گئی ہے۔ ان چیزوں سے جو مزاج بنتا ہے اس کی بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ بندگی کی روح یعنی مجاہدہ فی الاطاعۃ سے خالی رہ جاتا ہے اور تمام احوال و معاملات کو اپنے خیال اور خواہش کے تابع کر لیتا ہے۔ اس تخیل، تصنع اور تکلف کی گرفت جیسے ہی ہلکی پڑنے لگتی ہے آدمی ترکِ عبادت کی نوبت تک پہنچ جاتا

ہے یعنی مثال کے طور پر نماز میں اگر پسندیدہ کیفیات پیدا ہونے کے بعد غائب ہونے لگیں یا پیدا ہی نہ ہو سکیں تو یہ شخص نماز سے ہی کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ نماز میں یکسوئی یا حضوری نہ ہوتو بھی نماز کی حیثیت اور اس کی رغبت برقرار رہنی چاہیے۔ بندگی میں صبر کا پہلو کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوتا ہے اس کے ساتھ نباہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ پہلو نہ ہوتو بندگی ایک بے معنی چیز ہے۔ ہمارا کام بس اتنا ہے کہ نیت کو خالص کر کے اور ارادے کو اللہ کے حکم اور خوشنودی کی طرف موڑ کے اعمال عبودیت کو بتائی ہوئی بہتری کے پیمانے پر انجام دینے کی مسلسل کوشش کرتے رہیں اور یکسوئی وغیرہ کے ان تصورات کو شرط عمل نہ بنائیں۔ نماز مارے باندھے پڑھ لی تو بھی نماز ہے اور خوب رغبت و بشاشت سے ادا کر لی تو بھی وہی نماز ہے اور ہم میں سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان میں سے کون سی نماز اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے۔ یہی حال تمام اعمالِ عبودیت کا ہے۔ اتنی بڑی سہولت کے ہوتے ہوئے اپنی طرف سے مشکلات اور مشقتیں پیدا کر لینا دانشمندی کے خلاف تو ہے ہی، اخلاص اور دینداری کے برعکس بھی ہے۔ ایسا آدمی دین کے بنائے ہوئے حدود پر قانع اور مطمئن نہیں ہوتا اور ظاہر ہے کہ یہ ایک نہایت خطرناک مرض ہے جسے اگر سختی سے دیکھا جائے تو انکار دین کا ایک رویہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ نیت کے اخلاص، ارادے کی پختگی اور فہم کی صحت کے ساتھ بندگی کے موقف پر استقامت کے ساتھ قائم رہنا ہی وہ یکسوئی ہے جو دین میں مطلوب ہے اور یہی فطری بھی ہے۔ اسے زبردستی مصنوعی، رومانوی اور فلسفیانہ بنانا کوئی مفید اور بامعنی کام نہیں ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ استقامت اور اخلاص کی برکت سے اعمال کے اندر ایک گہرائی اور ارتکاز پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ اللہ کی عطا ہے اور بجائے خود مقصود نہیں ہے۔ یہ بات حاصل ہو جائے تو شکر کے ساتھ اس کی حفاظت کرنی چاہیے اور حاصل نہ ہو تو زور لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

س: ہمارے خیال میں بات اب بالکل واضح ہو گئی۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ دورِ جدید میں ذہن اور مزاج کی بنیادی ساخت میں خاصی گہری اور بڑی تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ آج کے آدمی میں دعاء کے ساتھ ذہنی اور طبعی مناسبت اس طرح کی نہیں پائی جاتی جیسی کہ پہلے لوگوں میں موجود تھی۔ ایسی صورت حال میں وہ کیا تدابیر ہیں جنہیں اختیار کر کے دعاء کی تاثیر کو برقرار رکھا جائے؟

ج: یہ ٹھیک ہے کہ جدید انسان نے اپنی ترقی اور نشو نما کا جو راستہ منتخب کیا ہے اور اس راستے پر کامیابی کے ساتھ خاصا سفر بھی طے کر چکا ہے، اس کا رخ بندگی کی سمت میں نہیں ہے۔ اپنی تمام صلاحیتوں، قوتوں اور رغبتوں کو محض دنیا میں صَرف کرنے اور پھر اس کے بڑے بڑے نتائج دیکھنے کی خواہش میں آج کا آدمی عبودیت کے اکثر بنیادی خواص سے دست بردار یا نامانوس ہو چکا ہے۔ اس کے ضمیر میں احتیاج، تذلل، بے بسی، خشیت اور اللہ سے تعلق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے دیگر بنیادی اوصاف کی کوئی قابل لحاظ جھلک موجود نہیں رہی۔ یہ جو آپ مسلمانوں میں تحریکی جوش کا غلبہ دیکھتے ہیں اس کے پیچھے یہی محرومی کارفرما ہے۔

ہم اپنے باطنی اور روحانی خلا کو کسی تحریکی عمل سے بھرنا چاہتے ہیں اور اس میں بھی ایک چیز ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی اور وہ ہے غالب رہنے کی خواہش۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، ہمارا مطلب یہ تھا کہ نیا آدمی مغلوبیت، غلامی اور بیچارگی وغیرہ سے نہ صرف یہ کہ کوئی ذہنی اور ذوقی مناسبت نہیں رکھتا بلکہ ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مغلوبیت وغیرہ کسی سیاسی مفہوم میں نہیں ہے بلکہ بندگی کی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ جدید آدمی کو نتیجے کا انتظار گوارا نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ نتیجہ عمل کے خاتمے سے جڑا ہوا ہو چاہے مرضی کے مطابق ہو یا مرضی کے خلاف۔ یہ اپنی کامیابی اور ناکامی کو اتفاق کے تابع تو کر سکتا ہے لیکن کسی ذات کے قبضہ قدرت میں نہیں دے سکتا۔ اس مزاج نے دینی اعتبار سے مشکلات اور رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔

دین انسانی نفسیات کی تمام بنیادوں کو یعنی ذہن، ارادے اور طبیعت کے مجموعے کو اللہ سے تعلق پر استوار دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی وہ بنیادی مطالبہ ہے جس کی تکمیل میں صرف ہونے والی کوششیں تزکیۂ نفس پر منتج ہوتی ہیں۔ آج کے انسان میں انکسار، اعتماد اور ایثار کی کمی دین کی طے کردہ ماہیت بندگی کے نہ صرف برعکس ہے بلکہ اس کے شعور اور طلب کو بھی پیدا ہونے نہیں دیتی۔ دعاء دراصل توکل علی اللہ، تضرع اور یقین کا مرکب ہے۔ بدقسمتی سے ہماری شخصیت کے اندر ان اوصاف کی قبولیت کا مادہ تقریباً غائب ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے طبعی انکسار کے بغیر تضرع، ارادی ایثار کے بغیر توکل اور ذہنی اعتماد کے بغیر یقین کا پیدا ہونا محال ہے۔ آپ اگر غور سے دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ ہمارے لیے دوسرا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ دوسرا انسان بھی ہو سکتا ہے اور خدا بھی۔ ہماری تگ ودو کا سارا عمل ہماری ذات سے شروع ہوتا ہے اور اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس مزاج میں ایک غیر انسانی خود انحصاری اور خود مرکزی ہے جس نے تعلق کی بنیادی ترین استعداد کو نقصان پہنچایا ہے۔ ہم انسانی تعلقات سے لے کر تعلق باللہ تک کے بے شمار مدارج میں کسی بھی درجے پر ایک معیاری حالت کے ساتھ موجود نہیں ہیں۔ یہ خرابی اگر محسوس ہو جائے اور ہم اس کی اصلاح پر آمادہ ہو جائیں تو دعاء ایک مفید ترین اور موثر ترین علاج ہے۔

ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ حسنِ تعلق یا شعورِ تعلق انسانی فطرت کا سب سے بنیادی اقتضا ہے۔ اس پہلو سے دعاء کو دیکھا جائے تو غالباً اس اقتضا کو دعاء سے بڑھ کر کوئی عمل پورا نہیں کرتا۔ دعاء یقیناً عرضِ احتیاج ہے لیکن اس کی اصلی حیثیت ایک شدید اظہارِ تعلق کی ہے جو بندہ اپنے مالک کے حضور میں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعاء قبول نہ ہو تو بھی کیفیتِ دعاء میں کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا۔ یہ بندے کی بے لوثی ہے جو اس کی محتاجی کے خلاف نہیں ہے بلکہ تعلق کا لازمی جزو ہونے کی وجہ سے تعلق باللہ میں بھی کارفرما ہے۔ اس بے لوثی میں وہ حقیقی احتیاج پوشیدہ ہے جو ہر حاجت کی اصل ہے یعنی اللہ کی خوشنودی کی طلب۔ سچے بندے کو دعاء کے نتیجے میں حاصل ہونے والی نعمتِ خداوندی پوری طرح مرغوب اور مطلوب ہوتی ہے لیکن عین حصولِ نعمت کی حالت میں بھی اصل تسکین اور خوشی اس بات کی ہوتی ہے کہ اللہ نے میری سن لی۔ جب بندے کی سب سے بڑی مسرت ہی یہ ہو کہ اللہ اس کی سنتا ہے تو پھر اسے مختلف حاجتوں پر مبنی دعاء کی مقبولیت پر اصرار نہیں رہتا۔

اسلام اور مغرب

فضل کریم بھٹی

مسلم معاشرے پر سیکولرازم کے اثرات
اور اہل علم ودانش کی ذمہ داری

مغربی تہذیب کی یلغار اور مسلمان اہلِ علم ودانش

مغربی تہذیب ایک ایسے دریا کی طرح تھی جس میں طوفان پورے زور سے آ گیا ہو اور وہ اپنے سیلاب کے سامنے ہر خس وخاشاک کو بہا کر لے جائے۔ اُس طوفان یا سونامی نے جہاں امریکہ کے وحشی اور غیر مہذب ریڈ انڈین کو لاکھوں کی تعداد میں ختم کر دیا وہیں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے قدیم باشندوں کا صفایا کر دیا۔ مسلمان انڈونیشیا سے لے کر مراکو تک پھیلے ہوئے تھے جو ایک بڑی تہذیب وتمدّن کے وارث تھے اور صدیوں تک دنیا میں سُپر پاور یا مقتدر قوت بن کر رہے تھے، مغربی تہذیب کی یلغار کے سامنے ایک ایک کر کے غلام بنتے گئے۔ اسلامی تہذیب کا دریا ایک بڑے تالاب یا جھیل کی شکل اختیار کر چکا تھا جو صدیوں سے ساکن تھی۔ مسلم معاشرہ صدیوں سے زوال پذیر تھا آغازِ اسلام سے مسلم معاشرہ عوامی رائے دہی یا مشاورت کے اصول پر قائم ہوا جبکہ وہ زمانہ جابر اور مطلق العنان بادشاہت کا تھا۔ خلافتِ راشدہ کا عوامی رائے دہی پر حکمرانی کا قیام ایک انقلابی پیش رفت تھی لیکن کچھ عرصے بعد مسلم اُمت خود بادشاہت میں تبدیل ہوگئی۔ پھر بھی مسلم معاشرے کی بنیاد اتنی مضبوط اقدار پر قائم تھی کہ وہ ایک ہزار سال تک دنیا میں مقتدر قوّت بن کر رہے۔ اِس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ باقی دنیا جاہلیت اور نکبت میں بُری طرح سے ڈوبی ہوئی تھی اور اُمتِ اسلامیہ اپنی کوتاہیوں، خرابیوں اور زوال کے باوجود کافی مہذب اور متمدّن تھی۔ یہ سلسلہ صدیوں تک چلتا رہا جب مغربی اقوام میں صلیبی جنگوں کے لئے اتحاد قائم ہوا اور انہوں نے گیارہویں صدی کے آخر میں صلیبی جنگیں شروع کر دیں تو اُمتِ مسلمہ کو نئے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔

پہلی صلیبی جنگ گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں شروع ہوئی اور آخری جنگ تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں ختم ہوئی۔ اِن جنگوں میں صلیبیوں نے شروع میں مسلمانوں کی نااتفاقی سے فائدہ اُٹھا کر بیت المقدس پر قبضہ بھی کر لیا لیکن آخر میں سلطان صلاح الدین نے اُن کو شکست دے کر بیت المقدس واپس لے لیا۔ کافی ہزیمت اُٹھانے کے بعد صلیبی پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ یاد رہے تمام مغربی اقوام میں عیسائیت کی اکثریت ہے اِسی لئے اُن کو کرسچین کلب کہا جاتا ہے صرف جنوب مشرقی یورپ میں البانیہ، بوسنیا، کوسوو اور مغربی ترکی مسلمان اکثریت کے علاقے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے وقت

یورپی قومیں کافی پسماندہ تھیں جب اُن کا صلیبی جنگوں کے وقت مسلمان ملکوں سے ربط وضبط اور میل جول ہوا تو انہوں نے مسلمانوں سے کافی کچھ سیکھا جو اُس وقت اُن کی نسبت کافی ترقی یافتہ تھے حالانکہ وہ خود زوال پذیر تھے۔ اِس طرح اُن میں ذہنی وسعت آئی اور انہوں نے نشاۃِ جدیدہ کا آغاز کیا۔ نشاۃِ جدیدہ کی مذہبی رہنماؤں، کلیسا کے پادریوں اور پوپ نے بڑی مخالفت کی اور جدید علوم وفنون کے داعی دار وگیر سے گزرے۔ رومن کیتھولک کلیسا کے خلاف مارٹن لوتھر جیسے پادریوں نے اعتراض اور تنقید کی اور پروٹسٹنٹ فرقہ وجود میں آیا۔ اب عیسائی ملک اتنے بیدار اور ترقی یافتہ ہو چکے تھے کہ اندلس کے زوال پذیر مسلمانوں کو اُنہوں نے شکست پر شکست دی اور بالآخر 1492ء میں سقوطِ غرناطہ کا حادثہ پیش آیا اور مسلمان اندلس سے ملک بدر کردیئے گئے یا زبردستی عیسائی بنالئے گئے یا قتلِ عام سے ختم کردیے گئے۔ اسی سال کولمبس نے نئی دنیا دریافت کرلی۔ 1498ء میں پرتگیزوں نے افریقہ کے جنوب سے ہندوستان کا نیا بحری راستہ دریافت کرلیا یہاں سے عرب اور ترک بیڑے تباہ کردیئے اور دنیا کے سمندروں پر چھا گئے۔ اسپین اور پرتگال کے بعد ڈچ اور فرانسیسی طاقت پکڑ گئے۔ اس کے بعد انگریز دنیا کی سُپر پاور بن گئے تقریباً ڈیڑھ صدی وہ دنیا پر چھائے رہے آخر جنگِ عظیم دوم کے بعد امریکہ دنیا میں سُپر پاور بن کر اُبھرا۔ اس طرح مغربی اقوام دنیا پر حکمران ہیں۔

نشاۃِ جدیدہ اور ملتِ اسلامیہ

عمارت جتنی بڑی اور مضبوط ہوگی اُس کو گرتے بھی اتنا ہی زیادہ عرصہ لگے گا۔ ملتِ اسلامیہ کی عمارت کی بنیاد بڑی مضبوط تھی اس لیے اسے گرتے بھی صدیاں لگ گئیں۔ تہذیبِ اسلامی کو نئے سرے سے اپنی بنیادوں پر کھڑا ہونے کے لئے جو ساز وسامان اور میٹریل درکار ہے وہ موجود ہے۔ اسلام اللہ تعالیٰ کا دین ہے جو اُس ذاتِ پاک کو پسند ہے وہ یہ نعمت قیامت تک قائم رکھے گا۔ دین مکمل شکل میں موجود ہے صرف عمارت کے لئے کاریگر کافی مقدار میں موجود نہیں۔ پرانی عمارت کے پرانے کاریگر نئی عمارت کھڑی کرنے کی نہ اہلیت رکھتے ہیں اور نہ ہی قابلیت۔ پرانی عمارت کے ناکارہ اور نالائق پرانے کاریگروں کو ہٹا کر نئے کاریگروں کو عمارت کا جدید اصولوں کے مطابق مضبوط اور پختہ نقشہ بنانا چاہیے اور پھر جانفشانی سے ایسی عمارت کھڑی کرنی چاہیے جو بہت پائیدار اور مضبوط ہو اور مغرب کی آندھیوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرسکے۔ پرانی عمارت کی مرمت اور پچی کاری اب بیکار ہے اس کی مرمت پر وقت ضائع نہ کیا جائے۔ قدیم مدرسوں اور سیکولر درس گاہوں کی جگہ اب تیسرا جامع اسلامی ماڈل تیار کرکے شروع کیا جائے وہ ایک ہی نظامِ تعلیم ہو اور اُس کا رشتہ آغازِ اسلام کے نظامِ تعلیم کے ساتھ قرآن وسُنت کی روشنی میں عصرِ حاضر کے ساتھ جوڑا جائے۔

ہمارے دینی مدارس کسی قسم کی اصلاح کے لئے تیار نہیں اور وہ اپنی پرانی ڈگر پر قائم ہیں۔تقریباً دوصدیوں سے دین دار جدید علوم وفنون کے اہلِ علم ودانش اُن کو مستقل مشورے دیتے آرہے ہیں کہ آپ فرسودہ قرونِ وسطیٰ کے مضامین منطق اور فلسفہ پر وقت ضائع نہ کریں اور جدید علوم وفنون سیکھ کر عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق مسلم عوام کی رہنمائی کریں لیکن وہ اپنی ہٹ پر قائم ہیں بلکہ اصلاح کی جتنی کوششیں ہوئی ہیں انہوں نے اُن کو ناکام بنادیا ہے۔مولانا شبلی نعمانی نے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں قائم کیا تاکہ نظامِ تعلیم میں دین ودنیا کی تفریق ختم کی جائے لیکن بدقسمتی سے ندوہ پر روایتی قدیم علماء کا غلبہ ہوگیا۔اس طرح ندوہ بھی دارالعلوم دیوبند کی طرح روایتی ہوگیا اور مولانا شبلی نعمانی کا تجربہ ناکام ہوگیا۔دوسری بڑی کوشش مولانا مودودی نے کی۔انہوں نے نظامِ تعلیم کی دوئی کو ختم کرنے کیلئے کئی مضامین لکھے اور تعلیمی اصلاحات لئے منصوبے اور تجاویز پیش کیں لیکن جماعت ِاسلامی بھی قدیم مدرسوں کا وفاق'رابطۃالمدارس الدینیہ' کے نام سے چلا رہی ہے اور روایتی درسِ نظامی کے فاضلین اِسے چلا رہے ہیں۔ہاں انہوں نے ساتھ ہی غزالی سکول بھی کھول رکھے ہیں جو جدید سیکولر تعلیم دے رہے ہیں۔البتہ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہماری جدید درس گاہیں اب اسلامی تعلیم کو بیچلر کے بعد ماسٹرز اور پی ایچ ڈی تک لے گئی ہیں۔اُن کا ماحول ابھی تک سیکولر ہے لیکن اگر کوشش کی جائے تو وہاں اصلاح کی اُمید ہے۔

مسلمان اہلِ علم ودانش کا اب تک رویّہ دوقسم کا رہا ہے۔دینی مدارس کے علماء اپنے خول میں بند رہنے میں عافیت سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو مغربی علوم وفنون سے دور رکھنے کو بہتر سمجھتے ہیں۔دوسری طرف جدید درس گاہوں کے تعلیم یافتہ دین دار لوگ ہیں جو مغربی تہذیب اور مغربی افکار کے زبردست ناقد ہیں لیکن خود کوئی اسلامی رول ماڈل تیار نہیں کرسکے۔مولانا شبلی ناکام ہوئے اور ندوہ پر روایت پرست گروہ نے قبضہ کرلیا۔ جماعت ِاسلامی روایت پرست گروہ کے قبضے میں ہے اور مولانا مودودی کی تعلیمی اصلاحات دھری کی دھری رہ گئیں۔ہم سے بہتر ریکارڈ اخوان المسلمون کا ہے جو عرب دنیا میں تبدیلی لارہے ہیں۔اسی طرح ترکی میں طیّب اردگان بڑے طریقے سلیقے سے ترک قوم کو سیکولرازم سے اسلام کی طرف لارہا ہے۔بعض حضرات تیسرے رول ماڈل کو اسلامی تعلیم کے ساتھ لانا چاہتے ہیں لیکن اُن کو کوئی پذیرائی حاصل نہیں ہورہی۔اِس میں ایک کوشش ڈاکٹر محمد امین،تحریکِ اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ لاہور کی ہے لیکن وہ درسِ نظامی کے فاضلین سے بھی کچھ اُمیدیں باندھے ہوئے ہیں جو تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ نے اُمتِ اسلامیہ کو دنیا کی قوموں کے سامنے ایک رول ماڈل معاشرے کے طور پر پیش کیا تھا جس کو اللہ تعالیٰ 'حزب اللہ' کہتا ہے اور اِس کے مخالف معاشرے کو 'حزب

الشیطان'۔ بدقسمتی سے حزب اللہ میں اتنی خرابیاں آ گئی ہیں کہ وہ خلفشار کا شکار ہوگئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا زمانہ معاشی لحاظ سے بڑا کٹھن اور مشکل تھا۔ تحریکِ اسلامی کے شروع میں مہاجرین اور انصار کو نانِ جویں میسّر نہیں تھی۔ اُن کے پاس پہننے کے لئے لباس دستیاب نہیں تھا۔ خستہ حالی اور غُربت تھی اس لئے وہ اپنی وضع قطع، لباس اور پوشش اور بود و باش پر توجہ نہیں دے سکتے تھے پھر جب فارغ البالی آئی تو انہوں نے سادگی کو اپنی زندگی کا طریقہ وسلیقہ رکھا اور اسراف سے اجتناب کیا۔ صدیاں گزرنے کے بعد اب دنیا ترقی کر چکی ہے۔ عام آدمی کی حالت قرونِ وسطیٰ کے زمانے سے کہیں بہتر ہے لیکن بعض لوگ ابھی تک آغازِ اسلام کے زمانے میں بیٹھے ہیں۔ وہ ابھی تک پرانی وضع قطع اور بود و باش پر زور دیتے ہیں۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور فطرت کے اصولوں پر چلنے کی ہدایت کرتا ہے اور فطرت کو بگاڑنے یا اُس کا مُثلہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اپنے بالوں کا اکرام کرو یعنی اُن کی اصلاح کرواور اُن کو صحیح طریقے سے سنوار کر رکھو لیکن بعض لوگ اپنی وضع قطع اور لباس میں بُہت لا پرواہ ہیں۔ داڑھی کے متعلق ہدایت ہے داڑھی کو بڑھاؤ مگر مقدار کا تعین نہیں اور مونچھیں پست رکھو لیکن بعض لوگ داڑھیوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور مونچھوں کو مونڈ دیتے ہیں۔ بعض لوگ داڑھی مونچھیں دونوں مونڈ دیتے ہیں یہ ساری ترکیبیں چہرے کو بدوضع بناتی ہیں۔ داڑھی اور مونچھیں اگر ایسی رکھی جائیں جو چہرے پر خوش نما لگیں تو یہی شرع کی صحیح ترجمانی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم عورتوں کے حقوق کی باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اور اُس کے رسول نے عورتوں کو حقوق عطا کئے۔ سوال یہ ہے کیا ہم اُن کو وہ حقوق دے رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے شرم و حیا اور پردے کا حکم دیا ہے اور گھر کو حرم بنایا ہے لیکن ہم نے عورتوں کے پردے کو تنگ کرتے کرتے اُن کو مسجدوں میں آنے سے بند کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم عوام نے بغاوت کر دی۔ اب ہزاروں مسلمان عورتیں ننگے سر ہمارے بازاروں اور بستیوں میں پھرتی ہیں۔ شدّت پسندی اور انتہا پسندی کی یہ حالت ہے کہ دنیا کمپیوٹر کے دور سے نکل کر انفارمیشن ٹیکنالوجی میں داخل ہوگئی ہے لیکن ہم اِس چیز پر بحث کر رہے ہیں کہ داڑھی کی کیا لمبائی چوڑائی ہو اور چہرے کا پردہ واجب ہے یا نہیں؟ اسلامی لباس کیا ہے اور پگڑی پہننا سنت ہے یا نہیں؟ یہ حالت اُس مسلم معاشرے کی ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حزب اللہ بنا کر بطور رول ماڈل پیش کیا۔ یہی حزب اللہ اب سب قوموں سے پسماندہ، ناخواندہ، مفلس اور خستہ حال ہے۔

مسلمانوں میں نشاۃِ ثانیہ کیوں نہیں آسکی؟

اُمتِ مسلمہ کا زوال بتدریج وقوع پذیر ہوا لیکن چونکہ عمارت مضبوط بنیادوں پر قائم تھی اس لیے صدیوں تک قائم رہی لیکن سقوطِ غرناطہ 1492ء کے بعد اس کا صحیح زوال شروع ہوا جب اندلس میں

مسلمانوں کا اقتدار ختم ہوا اور باقی مسلم معاشرہ اُن کی مدد کو نہ پہنچ سکا۔اس کے بعد خلافتِ عثمانیہ نے مسلمانوں کو کچھ سہارا دیا لیکن وہ سترھویں صدی عیسوی کے بعد خود زوال کے راستے پر چل پڑے آخر اُن کی زوال پذیر طاقت بیسویں صدی کے شروع میں ختم ہوگئی۔مرکزِ اسلام جیسا بھی تھا مرکز تھا جب خلافت کا ادارہ ختم ہوا تو اُمتِ اسلامیہ تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئی اور ابھی تک اسی حالت میں ہے۔اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے وہ دنیا میں کیوں اپنا مقام حاصل نہیں کر رہا اس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:

۱۔ جہانِ تازہ کی نمود افکارِ تازہ سے ہے۔جو افراد یا قومیں ساکن (Static) ہوجائیں وہ جمود کا شکار ہوجاتی ہیں اور جم جاتی ہیں۔جو چیز ساکن ہوجائے اور جم جائے وہ زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتی چونکہ زمانہ رواں دواں ہے۔یہ دنیا مستقل حرکت میں ہے اِس میں اگر کوئی رُک جائے یا ٹھہر جائے تو زمانہ اُسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔اُمتِ مسلمہ کے ساتھ یہی المیہ پیش آیا ہے۔اس کی گردش اور حرکت رُک گئی۔چوتھی صدی ہجری میں مسلمان اہلِ علم و دانش نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا اور تقلید پر چل پڑے۔اس طرح اُمتِ مسلمہ کی ترقی رُک گئی چونکہ شریعتِ اسلامیہ بُہت قوّت اور طاقت رکھتی تھی اور باقی قومیں ابھی تک پسماندہ تھیں اِس لئے مسلمان دنیا پر مقتدر قوّت بن کر چھائے رہے لیکن سترھویں صدی عیسوی کے بعد مغربی اقوام اپنی سمندری طاقت اور جدید علوم و فنون کی وجہ سے ساری دنیا پر غالب آگئیں اور زوال پذیر مسلمان ممالک غلام بنتے گئے۔اب وہ سیاسی آزادی حاصل کر چکے ہیں لیکن علمی اور معاشی لحاظ سے ابھی تک مغربی اقوام کے زیرِدست ہیں۔

۲۔ روایتی علماء جو اپنے آپ کو علمائے دین اور علمائے اسلام کہلاتے ہیں ابھی تک جدید علوم وفنون سے کورے اور نابلد ہیں۔وہ علمائے مغرب کا مقابلہ نہ دین کے مقابلے میں کر سکتے ہیں نہ دنیا کے مقابلے میں۔مغربی علماء وفضلا جو اعتراضات اور تنقید سائنسی اور جدید طریقے سے اسلام پر کرتے ہیں روایتی مسلم علماء اُس کا جواب نہیں دے سکتے۔مغرب کے علما جدید علوم وفنون اور سائنس کے علاوہ قرآن وسُنت کا دقیق اور گہرا مطالعہ کر کے میدان میں اُترتے ہیں اور پھر اسلام کے خلاف کتابیں لکھتے ہیں مگر ہمارے روایتی علماء جدید علوم وفنون سے نابلد ہیں اِس لئے وہ اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔جو مسلم دانش وران کا مقابلہ کر سکتے ہیں وہ علامہ اقبال، ڈاکٹر ذاکر نائیک اور ان جیسے دین دار لوگ ہیں لیکن ایسے لوگ تعداد میں بہت کم ہیں۔

۳۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جدید درس گاہوں کا پڑھا ہوا ہے جہاں سیکولر علوم وفنون کا راج ہے اُن پر سیکولر علوم کا کافی اثر ہوتا ہے اور وہ علومِ اسلامی سے زیادہ واقف نہیں ہوتے۔جدید یونیورسٹیاں اب علوم وفنون کی فیکلٹیز قائم کر رہی ہیں اور اب اعلیٰ تعلیم جیسے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے سکالر اور علماء تیار کر رہی ہیں لیکن اُن کا ماحول ابھی تک سیکولر ہے اور وہ اپنی درس گاہوں میں اسلامی ماحول بنانے میں کامیاب نہیں

ہوسکیں۔ساتھ ہی وہ ایسے علماء تیارنہیں کرسکیں جومساجد کے آئمہ اورخطباء کے فرائض ادا کرسکیں۔

۴۔ ہماری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم ابھی تک جدید علوم وفنون کے ساتھ اسلامی علوم وفنون کے ماہر علماء تیارنہیں کر سکے۔جس وقت ہم میں ایسے علماء کافی تعداد میں تیار ہو گئے جو روایتی علماء کی جگہ لے کر قوم کی رہنمائی کریں اوراُن میں دین ودنیا کی تفریق ختم کر کے قوم کو یک سو بنا کراُن میں یک رنگی پیدا کرسکیں اُس وقت ہم دین ودنیا کی فلاح کے راستے پرگامزن ہوسکیں گے۔اس کے لئے ہمیں ایسی ماڈل درس گاہ یا کالج کی ضرورت ہے جوہم میں دین ودنیا کے جامع علماء تیار کرے، جوقوم میں دین ودنیا کی تفریق ختم کردیں۔دینی مدارس میں فرقہ بندی اُن کی مجبوری ہے کہ اُن کی رزق روٹی کا یہی ذریعہ ہے۔ جو دردمند اہلِ دل اُن سے کسی اصلاح کی توقع رکھتے ہیں وہ صحیح حقائق نہیں سمجھ رہے۔یہی لوگ ہماری نشأۃِ ثانیہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں اوران کواُن کے حال پرچھوڑ دینا چاہیے کیونکہ وہ اصلاح کے لئے کبھی تیارنہیں ہوں گے۔اُن کے وفاق بنانا درُست نہیں تھااور نہ اُن کی سندوں کوجدید درس گاہوں کی سندوں کے برابر تسلیم کرنا درست تھا۔ہرنظامِ تعلیم اپنا نظریہ اورفکر ونظر رکھتا ہے۔درسِ نظامی کے فاضلین اپنا خاص نظریہ رکھتے ہیں اور وہ جامد تقلید کا نظریہ ہے۔وہ جہاں جائیں گے اپنی ذہنیت اور مائنڈ سیٹ پیدا کریں گے انہوں نے ندوہ اور جماعتِ اسلامی کو گھما کر روایت پرست بنادیا۔جس کوسیکولرزم کا مقابلہ کرنے کا خیال ہے وہ پہلے اپنے گھر کوٹھیک کرے اور جدید اسلامی رول ماڈل درس گاہوں کا بندوبست کرے تب ہی نشاۃِ ثانیہ کے جہاد کے لئے مجاہد اور غازی تیار ہوں گے۔میری گزارشات پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔اللہ تعالیٰ سے صحیح سوچ اورفکر ونظر کی دُعا ہے۔

مراجع

(1) تعلیمات،مولانا سیدابوالاعلیٰ مودودی

(2) تنقیحات،مولانا سیدابوالاعلیٰ مودودی

(3) نظامِ تعلیم، پروفیسر خورشیداحمد

(4) دینی مدارس میں تعلیم،سلیم منصور خالد

(5) ہماراتعلیمی بحران اوراُس کا حل،ڈاکٹر محمد امین

(6) دارالعلوم دیوبند، ڈاکٹر رشیداحمد جالندہری

اسلام اور سائنس محمد رشید

سائنس مخالفین کی فکری بنیادیں (۲)

ڈاکٹر محمد امین صاحب کا موقف: ہمیں جہاں اس چیز کا افسوس ہے کہ ماہنامہ البرہان کے اکتوبر 2012ء کے شمارہ میں ہمارے محترم و مخلص بزرگ ڈاکٹر محمد امین صاحب نے زیر بحث مکتب فکر کے خیالات کو قیمتی اور اہم قرار دیتے ہوئے ان سے اصولی اتفاق کا اعلان کیا ہے۔ وہاں ان کا یہ موقف پڑھ کر اطمینان ہوا کہ:

''حاصل اس مبحث کا یہ ہے کہ جس طرح یہ غلط ہے کہ مغرب سے سب کچھ لے لیا جائے اور اس کی پیروی کی جائے، اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ مغربی تہذیب سے استفادے کو حرام سمجھا جائے اور اسے کلیۃً رد کر دیا جائے۔ کیونکہ ایک زندہ تہذیب انسانی تجربے کے طور پر دوسری تہذیبوں سے اخذ و استفادہ کرتی ہی ہے خواہ وہ اس کے مخالف اصولوں پر ہی قائم ہو۔ آپ کتابی طور پر ایک اصول بنا بھی لیں تو اس کا کیا فائدہ جب عملی زندگی میں اس پر عمل ممکن نہ ہو۔

خلاصہ یہ کہ ٹیکنالوجی اس وقت قوت و سطوت کا مظہر اور وسیلہ ہے۔ اسی وجہ سے مغرب نہیں چاہتا کہ مسلم ممالک اس ٹیکنالوجی خصوصاً اعلی حربی ٹیکنالوجی کے حامل ہو جائیں۔'' (البرہان، اکتوبر 2012)

ہم سمجھتے ہیں کہ اپنے اس موقف کے ذریعے سے محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب نے زیر بحث مکتب فکر کی فکری بنیادوں ہی پر تیشہ چلا دیا ہے اور اس کے زہر کو نکال باہر پھینکنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اقتباس قرآنی ہدایت سے محروم اس یک رخی فکر اور مغربی فلاسفہ و حکماء (مجدد الف ثانیؒ کے الفاظ میں حمقاء)، جن کا اعلان ہے کہ:

(You can take Western Civilization (Secularism+Techno-Science) as an indivisible package. So you are not allowed to pick and choose)

سے فکری بنیادیں حاصل کرنے والی بے برکت و بے ثمر سوچ کے مقصود اور نصب العین ہی کے گلے پر چھری رکھ دینے کے مترادف ہے۔

محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب کا یہ بیان انہیں زیر بحث مکتب فکر کے مخالفین کی صف میں شامل کر دیتا ہے۔ کیونکہ یہ مکتب فکر تو اپنی گفتگو اور دعویٰ کا آغاز ہی ان محترم مسلم مفکرین پر تنقید سے کرتا ہے جو سائنس یا مغربی تہذیب کے کسی عنصر کو قابل استفادہ سمجھتے ہوں۔ کون نہیں جانتا کہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ، ڈاکٹر رفیع الدینؒ، سید ابوالحسن علی ندویؒ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ مغربی تہذیب کے سخت ناقد تھے۔ ان حضرات کی تحریریں نہ صرف امت مسلمہ بلکہ انسانیت کی فلاح و نجات کے لیے قرآن و سنت اور

شریعت محمدیﷺ کی پیروی کی دعوت سے بھری پڑی ہیں لیکن اپنے اس زوردار اور واضح موقف کے باوجود یہ محترم مفکرین محض اس وجہ سے زیر بحث مکتب فکر کے مطعون قرار پاتے ہیں کہ وہ مغربی تہذیب کے مثبت عناصر اور سائنس و ٹیکنالوجی کو مسلم معاشرے کے لیے قابل استفادہ سمجھتے ہیں۔

عقل وخرد کے لیے یہ دعویٰ اور دلیل بھی ایک معمہ ہے کہ سائنس اور انکار وحی لازم وملزوم اور ناقابل تقسیم وحدت ہے، لہٰذا ٹیکنو سائنس اقدار گُش ہے۔ یہ مؤقف معمہ اس لیے ہے کہ قرآن وسنت نے انسانوں کے بارے میں تو واضح کر دیا ہے کہ وہ یا تو مسلم ہوں گے یا پھر کافر وملحد لیکن انسانوں کے بارے میں یہ دو واضح تقسیمیں بتانے کے بعد شریعت چیزوں، استعمالات، آلات و وسائل کے بارے میں قطعاً ایسا کوئی حکم نہیں لگاتی کہ فلاں چیز کافر ہے اور فلاں چیز مسلمان۔ اشیاء کے بارے میں شریعت نے اصولی ہدایت دی ہے کہ جو چیز بھی مجموعی طور پر ضرر (تکلیف) پہنچانے والی ہو اس کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اور پھر اس کا اختیار وانحصار انسان کے اجتماعی ذہن پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ کون سی چیز مجموعی طور پر انسان کے لیے باعث ضرر وآزار (نقصان وتکلیف) پہنچانے والی ہے جس کے نتیجے میں انسان کی اجتماعیت یہ فیصلہ کرے کی کہ اس کا استعمال ممنوع کر دیا جائے۔ ہم سوچ سوچ کے تھک گئے ہیں کہ اس دعویٰ کو ہم کیسے justify کریں کہ انسانی استعمالات کی چیزیں (جدید ٹیکنو سائنس کے نتیجے میں وجود میں آنے والی چیزیں) بھی اقدار گُش ہوا کرتی ہیں؟ ہماری ناقص عقل ہم سے مخاطب ہوتی ہے کہ صاحب! انسان یا تو کافر ہوتا ہے اور یا مسلمان۔ انسان ایک جیتا جاگتا وجود ہے، اسے قدرت کی طرف سے بے پناہ صلاحیتیں دی گئی ہیں، دوسرے انسانوں پر اثر آفرینی کی اس کو بے پناہ طاقتیں دی گئی ہیں لہٰذا ایک کافر وغیر مسلم زندہ انسان میں اقدار کو بدلنے اور انہیں تلپٹ کرنے کی ایک غیر جاندار چیز کے مقابلہ میں بے پناہ زیادہ قوت وصلاحیت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ایک کافر، ایک عیسائی، ایک یہودی، ایک ہندو اور ایک پارسی ومجوسی کو اسلامی مملکت میں رہنے کی اجازت دی گئی ہے، بطور کارکن اور بطور خدمت گار اس سے خدمت لینے کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

آیئے ہم چند لمحوں کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ زندہ انسانوں کی طرح ''چیزیں اور استعمالات'' بھی کافر ہو سکتی ہیں یا کفریہ عقائد کی حامل ہو سکتی ہیں۔ اگر یہ مفروضہ مان بھی لیا جائے تب بھی شریعت کی نگاہ میں تو ایک زندہ کافر انسان کو اسلامی معاشرے میں رہنے اور بطور کارکن اور خدمت گار سرگرمی کی اجازت ہے تو اس اصول کے تحت ایک غیر جاندار (کافر) چیز سے معاشرے کی خدمت گاری کا کام بھی زیادہ احسن طریقے سے لیا جا سکتا ہے۔ پھر جس طرح یہ بات درست ہے کہ ایک زندہ کافر انسان کو مسلمان بنایا جا سکتا ہے تو ایک غیر جاندار چیز کو بھی زیادہ آسان طریقے سے مسلمان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن زیر بحث مکتب فکر اس کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں۔

فساد کی اصل جڑ: ہم مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے صدیاں ہوگئیں قرآن کو طاق پر رکھ دیا ہے، شریعت سے جان چھڑالی ہے، سنت ہمارے معاشروں میں اجنبی ہوچکی ہے جس کے نتیجے میں ایسا بدترین بگاڑ، زوال اور ذہنی شکست و پستی پیدا ہوچکی ہے کہ زندہ کافر انسان تو دور کی بات ہے کافر کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کے استعمالات سے متاثر ہوکر بھی ہم بگٹٹ کفر کی طرف بھاگنے لگتے ہیں اور کافروں کی غلامی و مشابہت اختیار کرنا قابل فخر سمجھنے لگتے ہیں۔ زوال و ذہنی پستی کی یہ وہ بدترین صوتحال ہے جس نے مسلمانوں کے بعض خیرخواہ طبقات میں ہیجان انگیز ردعمل پیدا کیا۔ نتیجتاً انہوں نے ہر اس سمت اور ہر اس راہ کے آگے مصنوعی دیوار کھڑی کرنے کی کوشش کی جہاں سے کفر درآنے کا خطرہ ہوا یہاں تک کہ حیات انسانی کے اوپر تلے اور اردگرد اتنی فصیلیں اور اتنی دیواریں کھڑی کردی گئیں کہ زندگی کا نظام اور زندگی کی حرکت مفلوج ہوکر رہ گئی۔ اور اس حبس زدہ اور تاریک ماحول میں زندہ رہنا اور سانس لینا بھی محال ہوتا چلا گیا لیکن کفر وفسق تھا کہ رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا کیونکہ فساد اور بیماری درحقیقت خارج سے زیادہ داخل میں تھی لیکن مسلم قائدین اس کا علاج خارج میں کرتے رہے۔ پھر دنیا نے یہ حیرت انگیز تماشا بھی دیکھا کہ ان بڑی بڑی فصیلوں اور دیواروں میں محصور اور قید مسلم مذہبی طبقہ دنیا کی حقیر چیزوں کی خاطر ایمان و دین کا سودا کرتا رہا، بہت ہی سستی قیمت پر دین کو بیچتا رہا، معمولی معمولی باتوں پر بدترین اختلافات وتفرقہ بازیوں کو فروغ دیتا رہا، ایمان کا اہم ترین مظہر حسن اخلاق ایک نایاب چیز بن کر رہ گئی۔ بدعات، خرافات، فروعی اختلافات میں اخلاق کی بدترین پامالی، دنیا پرستی، حرص وطمع، لالچ وشح ان فصیلوں میں پل پل کر خوفناک دیو کی شکل اختیار کرتی رہیں۔

سائنس پڑھنے والوں اور نہ پڑھنے والوں کا تقابلی مطالعہ: اس کے برعکس مسلمانوں کا وہ طبقہ جو ان مصنوعی دیواروں اور فصیلوں کی حدود سے باہر دین ومعیشت کے لحاظ سے کسمپرسی کی زندگی بسر کررہا تھا، وہ اپنے ممالک کے جدید تعلیمی اداروں میں پہنچا اور سائنسی تعلیم حاصل کرنے لگا تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ اس طبقہ میں سے 'ایک لاکھ' میں سے ایک بھی ''وحی کے انکار'' (سائنس کا لازمہ) کا نہ ہی اعلان کرتا ہے نہ ہی اظہار بلکہ اس کے برعکس اس طبقہ کی ایک قابل ذکر تعداد قرآن وسنت سے گہرے لگاؤ اور محبت کا نہ صرف کھلم کھلا اظہار کرتی ہے بلکہ جدید تعلیمی اداروں میں درس قرآن اور دعوت دین کا علم بلند کرتی ہے۔ سائنس پڑھنے والے اس مسلم طبقہ کی طرف سے درس قرآن (آسمانی وحی) کی ایسی طاقتور صدا بلند ہوتی ہے کہ سائنس کو کفر سمجھنے والے اور اس کفر سے بچنے کے لیے اپنے اردگرد ناقابل عبور فصیلیں اور دیواریں کھڑی کرنے والے طبقہ کی سماعتوں تک سے یہ صدا جاٹکراتی ہے اور انہیں یہ مسحور کن صدا اس حد تک متاثر کردیتی ہے کہ وہ مذہبی طبقہ جو مدتوں قصوں، کہانیوں اور زیادہ سے زیادہ بزرگوں کے ملفوظات وواقعات کے سننے سنانے ہی کو دین کی آبیاری کے لیے کافی سمجھ بیٹھا تھا، اب اسے خطرہ محسوس ہونے لگا

کہ اگر انہوں نے بھی درس قرآن کی صدا نہ لگائی تو ان کے پیروکار یہ دیواریں اور فصیلیں گرا دیں گے اور اس جدید طبقہ سے جا ملیں گے جو درس قرآن کی محفل سجائے بیٹھے ہیں لہٰذا اس مذہبی طبقہ میں ''درس قرآن'' کے عنوان سے دینی دعوت وتربیت کے کام کا آغاز ہوا۔

پھر دنیا یہ عجوبہ بھی کھلی آنکھوں سے دیکھتی ہے کہ سائنس کے کفر سے بچنے کے لیے بڑی بڑی فصیلوں میں چھپا ہوا وہ مذہبی طبقہ جس نے سائنس کی الف ب بھی نہیں پڑھی اور جس کا اوڑھنا بچھونا مذہبی علوم ہیں، ان ہی میں سے ایک فاضل مرزا غلام احمد تاریخ انسانی کا بدترین فتنہ ''انکار ختم نبوت'' کو جنم دیتا ہے۔ مذہبی درسگاہوں ہی کے تربیت یافتہ اور فاضل سر سید احمد خاں اور تمنا عمادی وغیرہم ''انکار سنت'' کے منحوس پودے کی پرورش کرتے ہیں، سائنس (کفر) کے علم سے محروم ومحفوظ اور مذہبی علوم میں ماہر احمد رضا خاں صاحب بریلوی اپنے وقت کے جید ترین اہل اللہ اور متدین علمائے کرام پر کفر کی گولہ باری کرتے ہیں اور ان کو کافر نہ ماننے والوں پر بھی کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں اور بدعات کو مذہبی سند فراہم کرتے ہیں اور امت میں ایک نہ ختم ہونے والے تفرقہ کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔اس کے برعکس سائنس پڑھنے والوں میں ڈاکٹر محمد اقبال پیدا ہوتا ہے جس کی شاعری از اول تا آخر قرآن واتباع رسول ﷺ کی دعوت اور مغرب کی غلامی کی مذمت سے بھری پڑی ہے۔ پھر کیمبرج سے تعلیم حاصل کرنے والے چوہدری رحمت علی اپنے وقت کی سپریم طاقت کے اعلیٰ ترین سیاسی دماغوں سے دلیل کے میدان میں قرآن (آسمانی وحی) کے ماننے والوں کے تحفظ کے لیے تاریخ کی انوکھی ترین جنگ تن تنہا لڑتے ہیں، اسی طرح علی گڑھ جیسے نام نہاد سائنسی تعلیمی ادارے، جہاں سائنس کی بجائے مغربی سولائزیشن کی تعلیم دی جاتی تھی، کے تعلیم یافتہ مولانا محمد علی جوہر احیائے خلافت (آسمانی وحی پر مبنی نظام سیاست) کی تحریک کی قیادت کرتے ہیں ،آگے چلیے اسی سائنس (کفر) کی تعلیم حاصل کرنے والوں میں ڈاکٹر اسرار احمد پیدا ہوتے ہیں جو اپنی دعوت کا مرکز ومحور ہی ''درس قرآن'' (آسمانی وحی) کو بناتے ہیں۔

زیر بحث مکتب فکر کے مفروضہ کو یہ حقائق بھی رد کر دیتے ہیں کہ عالم عرب کے سید قطب شہید، انجینیر اسامہ بن لادن، افغانستان کے انجینیر گلبدین حکمت یار وہ بڑے بڑے نام ہیں جنہوں نے زندگی کے بہترین اور قیمتی ترین سال سائنس کی تعلیم حاصل کرنے پر لگا دیے، لیکن اس کے باوجود مادہ پرستانہ اور وحی کے انکار پر مبنی تہذیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا دلیل، دعوت اور میدان جنگ ہر محاذ پر انہوں نے مقابلہ کیا۔ اسی طرح ہندوستان کے ڈاکٹر ذاکر نائیک بھی زندگی کے بہترین سال سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود وحی کے انکار کی دعوت لے کر کھڑے نہیں ہوتے بلکہ اس کے بالکل برعکس عالمی پیمانے پر مستند ترین ومحفوظ ترین وحی (قرآن اور اسلام) کی دعوت کا حیران کن پلیٹ فارم کھڑا کر دیتے ہیں۔ زندگی کے بہترین سال سائنس کی تعلیم حاصل کرنے والے اور پاکستان کی ایک

انجینیر نگ یونیورسٹی میں سائنس پڑھانے والے انجینیر ذوالفقار احمد نقشبندی بجائے وحی اور مذہب کے انکار کے مشرق و مغرب کے لاکھوں انسانوں میں وحی کے والہانہ اقرار پر مبنی ''تعلق مع اللہ'' کی غیر معمولی تحریک کو فروغ دے رہے ہیں۔ پاکستان کو دنیا کی ساتویں بڑی ایٹمی طاقت بنانے والے سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ڈاکٹر ثمر مبارک مند ''وحی کے انکار'' کی راہ پر چلنے کی بجائے پاکستان میں اٹامک انرجی پر کام کرنے والے اداروں میں ایسے ماحول کی سرپرستی کرتے ہیں جس میں ''درس قرآن'' پر مبنی وحی کے اقرار کے حلقے قائم ہیں۔ حیرت ہے کہ درج بالا تمام قابل ذکر شخصیات (سائنس مخالفوں کے مفروضے کی رو سے) وحی کے انکار (سائنس) کی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود پورے عالم میں وحی کے اقرار کی غیر معمولی تحریکوں کے روح رواں بن جاتے ہیں۔

یہ سلسلہ اس حد تک بڑھتا ہے کہ بیسویں صدی کے اختتام تک اور اکیسویں صدی کے شروع میں مشرق و مغرب میں ''سائنس'' پڑھنے والے طبقات کے ذہین ترین افراد کثیر تعداد میں قرآن کی محبت اور پیاس میں دیوانہ وار لپکتے ہیں۔ مغرب جہاں پچھلے دوسو سالوں سے تعلیم کا سارا منہاج اور اس کی اساس ''سائنس اور نام نہاد سائنسی مابعدالطبیعیات'' پر استوار کی گئی ہے اس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذہین ترین افراد قرآن سے متاثر ہوکر اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ برطانیہ کے شاہی خاندان کی قابل ذکر تعداد اسلام قبول کر چکی ہے، عالم مغرب میں 30 ہزار سے زائد خواتین حلقہ بگوش اسلام ہو جاتی ہیں۔ امریکہ اور فرانس جیسے سائنس کی پرستش کی حد تک تعظیم کرنے والے ممالک میں اسلام سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن جاتا ہے۔

حیرت کا پہلو یہ بھی ہے کہ زیر بحث مفروضہ یعنی ''وحی کے انکار'' (سائنس) پر مبنی تعلیمی اداروں سے وحی کے اقرار اور اسلام کے دفاع کے لیے کم و بیش اتنی ہی اعلیٰ پائے اور اخلاص کی حامل لیڈر شپ ابھر کر سامنے آتی رہی ہے جتنی کہ سائنس کی تعلیم سے اپنے اداروں کو پاک رکھنے والے دینی مدارس سے دستیاب ہوئی ہے بلکہ بعض پہلوؤں سے سائنس کی تعلیم حاصل کرنے والے انجینیر اسامہ بن لادن، انجینیر حکمت یار کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ عصر حاضر کے فرعون اور عالمی استعمار کو یہ مسلمان انتہائی مطلوب رہے ہیں۔ اسی طرح پاکستان سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ امریکہ بار بار ان تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر سلطان بشیر الدین کو بھی امریکی حکم پر اٹامک انرجی سے فارغ کیا گیا۔ دنیائے علم کے اعلیٰ ترین امریکی ادارے ہارورڈ سے ڈاکٹریٹ کی تعلیم حاصل کرنے والی ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو محض قرآن اور نبی اکرم ﷺ کو اپنا آئیڈیل بنانے اور اس سے غیر مبدل وابستگی کے جرم میں عصر حاضر کا فرعون عبرت کا نشان بنا کر رکھ دیتا ہے۔

یہ سارے واقعات اس بات کا کھلم کھلا اعلان کر رہے ہیں کہ عالم کفر اس بات کو برداشت کرنے

کے لیے قطعاً تیار نہیں ہے کہ سائنس کی تعلیم حاصل کرکے اسے اسلام کی خدمت کے لیے استعمال کیا جائے۔امریکی ومغربی استعمار صرف اسی مسلمان کے لیے عزت، دولت اور کامیابی وکامرانی کے دروازے کھول دیتے ہیں جو سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مذہب سے باغی ہوجائے، اقدار کے حوالہ سے کھوکھلا ہوجائے، دین ووطن کے معاملے میں بےحمیت بن جائے اور ہر پہلو سے مغربی شیطانی تہذیب کے رنگ میں رنگنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کردے۔تاہم جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ جدید تہذیب اور سائنس کی تعلیم سے ہمکنار ہونے کے بعد مسلم نوجوانوں میں اور اسلام وقرآن سے مکالمہ کے بعد مغرب کے تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کی محبت اور پیروی کا ایک حیران کن جذبہ بیدار ہوا ہے۔

نام نہاد سائنسی مابعدالطبیعیات دلیل کے میدان میں: اس صورتحال سے خوفزدہ ہوکر عالمی ابلیسی استعمار کے آلہ کاروں اور ٹھیکیداروں کی نیندیں حرام ہوجاتی ہیں اور وہ دن رات منصوبے بنانے لگتے ہیں کہ قبولیت اسلام کے اس تیزی سے بڑھتے ہوئے رجحان کو کس طرح روکا جائے تاکہ ابلیسی سرمایہ دارانہ مفادات خطرہ میں نہ پڑ جائیں کیونکہ مغرب کے باشندوں کو چار سو سال تک ''سائنس اور سائنسی مابعدالطبیعیات'' کے جھوٹ سے بے وقوف بنانے کا داؤ اب مزید چلتا دکھائی نہیں دیتا۔جلدی میں اور گھبراہٹ میں شیاطین/قائدین مغرب نے ایک اور جھوٹ گھڑا......اسلام کے خلاف دہشت گردی کا جھوٹ۔اس مقصد کے لیے پوری دنیا میں عالم اسلام کے خلاف پراپیگنڈہ کیا گیا،عراق کے خلاف بالکل جھوٹے اور فرضی الزام پر مبنی خوفناک جنگ شروع کی گئی۔پھر افغانستان پر دنیا کے تمام مغربی ممالک کا گٹھ جوڑ حملہ آور ہوتا ہے اور پچھلے دس سال سے یہاں تباہی و بربادی پھیلا رہا ہے۔ایک طرف جنگ اور بندوق کے ذریعے اسلام کو مٹانے اور اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے تو دوسری طرف میڈیا اسلام سے تعصب، عناد اور عداوت کی وجہ سے ننگی جارحیت اور اخلاق باختگی پر اتر آتا ہے چنانچہ تاریخ انسانی کی محترم ترین ہستی، انسانیت کے ماتھے کا جھومر اور انسانیت کے سب سے بڑے محسن محمد رسول اللہ ﷺ کے توہین آمیز اور تمسخرآمیز خاکے پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا میں بار بار اور بتکرار شائع کیے جاتے ہیں۔عالم مغرب نے مہلک ترین ہتھیاروں اور میڈیا کی اس ننگی جارحیت کا ارتکاب کرکے درحقیقت ثابت کردیا ہے کہ نظریہ، دلیل اور علم کے میدان میں وہ اسلام کا مقابلہ کرہی نہیں سکتا۔پانچ سو سال تک مغرب کے انسانوں کو''سائنس'' اور''سائنسی مابعدالطبیعیات'' کے نام سے بے وقوف بنانے، سیکولرزم ولبرل ازم کے نشوں میں مست رکھنے اور انہیں مذہب کے حقیقی ثمرات سے محروم رکھنے کے لیے انہوں نے جھوٹ اور دجالیت کی جو دکان سجائی تھی، اسلام اور قرآن سے مکالمہ کے بعد اس دکان میں ایک زلزلہ برپا ہوگیا کہ مغرب کے باشندے ٹیکنو سائنس کے تمام تر فوائد سے مستفید ہوتے

رہنے کے باوجود سیکولرازم ولبرلزم کی غلاظتوں کو پرے پھینک کر قرآن کی آسمانی ہدایت کی طرف لپکنے لگے تھے، جس کی وجہ سے گمراہی کے بیوپاریوں کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر یہ رجحان زور پکڑ گیا تو نتیجے میں ان کی ضلالت و گمراہی کی دکان کہیں بند ہی نہ کرنی پڑ جائے لہٰذا ضلالت و گمراہی اور دجالیت کی اس دکان کو بچانے کے لیے مغرب کا شیطانی سرمایہ دار طبقہ ننگی جارحیت پر اتر آیا۔

اس طوالت پر ہم معذرت خواہ ہیں، ہمارا مقصود صرف یہ واضح کرنا ہے کہ سائنس اور کفر (انکارِ وحی) کو لازم و ملزوم قرار دینا، سائنس کے ٹھیکیداروں، سرمایہ داروں اور گمراہی بیچنے والے مغربی دکانداروں کا بدترین جھوٹ اور دجل ہے جسے ہم نے نہایت سادگی اور فرمانبرداری سے سچ مان لیا ہے لیکن خود سائنس وقفہ وقفہ سے اپنے ماننے والوں کو ''انکارِ وحی'' سے انکار کرنے پر اکساتی رہتی ہے۔

مغرب کے فلاسفہ کو سائنس کی دنیا کے پیغمبر قرار دینے اور ان ''پیغمبران سائنس'' کے افکار پر اپنے فلسفہ کی فکری بنیادیں استوار کرنے والے زیر بحث مکتب فکر کے نزدیک سائنس یا ٹیکنو سائنس کی تعریف یہ ہے:

سائنس = (کائنات پر ارادۂ انسانی کا تسلط + وحی کا انکار) = کفر و ضلالت = قابل رد و قابل نفرت

گویا اس مکتب فکر کے نزدیک سائنس و ٹیکنالوجی اور انکار وحی (کفر) ایک ناقابل تقسیم وحدت کا نام ہے، اسی وجہ سے قابل رد ہے۔ آیئے چند لمحوں کے لیے اس مکتب فکر کے اس دعویٰ اور دلیل کو ہم درست مان کر دیکھتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے:

(۱) قرآن حکیم، حدیث اور دینی لٹریچر جدید پریس مشینوں پر چھپ رہا ہے، لہٰذا یہ نہ صرف کفر ہے بلکہ اسلامی شعائر کی توہین بھی ہے چنانچہ آپ جب بھی قرآن کی تلاوت کرنے بیٹھیں گے انکارِ وحی یعنی ٹیکنو سائنس سے استفادہ کی وجہ سے گناہ کے مرتکب ہو رہے ہوں گے۔

(۲) نماز کے لیے لاؤڈ سپیکر کا استعمال وحی کے انکار یعنی ٹیکنو سائنس سے مفاہمت کے نتیجے میں ہو رہا ہے لہٰذا یہ بھی ایک بہت بڑا گناہ ہوا۔

(۳) آپ جو کپڑے پہن کر نماز پڑھتے ہیں وہ فیکٹری سے بن کر نکلتے ہیں، چنانچہ آپ عین نماز کی حالت میں بھی ٹیکنو سائنس یعنی انکار وحی سے مفاہمت کی وجہ سے گناہ گار ہو رہے ہوتے ہیں۔

(۴) مسجد میں گھڑی لگی ہوئی ہے یہ بھی انکار وحی کا اعلان کر رہی ہے۔

(۵) مسجد میں روشنی اور پانی کا انتظام بجلی کا مرہون منت ہے جو درحقیقت وحی کے انکار ہی کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہا ہے۔

(۶) آپ کی سواری (موٹر سائیکل، کار، بس، ریل، ہوائی جہاز) بھی وحی کے انکار کا گناہ سر پر لیے ہوئے ہے۔

(۷) آپ کے کھیتوں میں ہل ٹریکٹر سے چلایا جاتا ہے، آپ کی گندم تھریشر، چائنا چکی اور گیس کے

چولہوں سے گزر کر آپ کے پیٹ میں پہنچتی ہے، آپ کے کھیتوں میں کھاد فرٹیلائزر فیکٹری کی استعمال کی جاتی ہے اور یہ سب تو ''وحی کے انکار'' (ٹیکنو سائنس) کے نتیجے میں وجود میں آئی ہیں لہٰذا وحی کا انکار آپ کے کھیتوں میں، حتی کہ آپ کے پیٹ میں بھی گھس گیا ہے۔

(۸) آپ حج کرنے جارہے ہیں اور ہوائی جہاز پر سفر کر رہے ہیں، وہاں جا کر بسوں وغیرہ پر سفر کرتے ہیں، حرم پاک میں بجلی سے استفادہ کرتے ہیں، آپ سمجھتے ہیں کہ آپ بہت بڑی عبادت کر رہے ہیں لیکن آپ کو یہ پتہ ہی نہیں کہ آپ اتنی عظیم الشان عبادت کرتے وقت بھی مسلسل وحی کے انکار کا گناہ سر پر لادے ہوئے ہیں۔

ہمارے خیال میں یہ نتائج دیکھ کر آپ کو غصہ بھی آئے گا اور ہنسی بھی اور آپ سائنس وانکار وحی کو لازم وملزوم اور ناقابل تقسیم وحدت قرار دینے والوں کے فلسفہ کو اٹھا کر پرے پھینکنے ہی میں عافیت محسوس کریں گے۔

اس مضحکہ خیز نتائج کی حامل سوچ کو ایک علمی فلسفہ کے طور پر ماننے اور منوانے والے حضرات قلم و قرطاس کے ذریعے سے اپنا اور دوسروں کا وقت برباد کرنے کی بجائے اگر اپنے اس فلسفہ پر عمل کرنا ہی شروع کردیں تو یقین مانیں ان کی اس ثابت قدمی اور قول وفعل کی ہم آہنگی پر ہم ان کے ہاتھ چومیں گے، انہیں سیلوٹ کریں گے اور ان پر رشک کریں گے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو ہم دست بستہ ان سے التجا کرتے ہیں کہ وہ ایسے نامعقول وناقابل عمل فلسفہ کے بیان میں اپنی صلاحیتیں اور وقت ضائع نہ کریں، جس پر وہ خود بھی عمل پیرا نہیں ہو سکتے۔

اختتامی کلمات: آخر میں ہم ایک بار پھر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ نہ ہی ہم سائنس سے مرعوبیت کا شکار ہیں اور نہ ہی ہمیں زیر بحث سائنس مخالف مکتب فکر سے کوئی عداوت یا ضد ہے۔ اس کے برعکس شروع شروع میں جب ہماری نظروں سے سائنس مخالف مکتب فکر کی چند تحریریں گزریں تو ہمیں نہ صرف حیرت بلکہ خوشی ہوئی کہ پاکستان میں سائنس کی اندھی عقیدت میں مبتلا اور اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے والوں اور کنویں کے مینڈکوں کی طرح ٹرانے والوں کے برعکس سائنس کی اندھی تقلید کے محاکمہ و تنقید پر مبنی کوئی تو تحریر پڑھنے کو ملی۔ ہمیں زیر بحث مکتب فکر سے خاصی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اسی دوران اس مکتب فکر کے موجودہ فکری قائد جناب خالد جامعی کی چند تفصیلی تحریریں ہمارے ہاتھ لگیں اور ہم نے پورے خلوص نیت اور دلچسپی سے اس نکتہ نظر کو اس کے استدلالات و بنیادوں سمیت سمجھنے کی کوشش کی لیکن ہمیں بڑے دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ مطالعہ کے دوران کہیں کہیں دلچسپ مواد اور موقف سے لطف اندوز ہونے کے باوجود ہم اس مکتب فکر کے موقف کا کوئی بنیادی سرا تو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ تاہم اس فکر کے بارے میں عدم توازن اور بے مقصدیت کا تاثر پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ اسی

دوران البرہان (مارچ، اپریل 2012 کے شمارہ) میں پروفیسر زاہد صدیق مغل صاحب کے شائع ہونے والے مضمون نے سائنس مخالف مکتب فکر کی واضح اور ٹھوس انداز میں ترجمانی کی اور مکالمہ کے لیے بنیادی سرا فراہم کیا۔ ہمارے خیال میں اس مضمون میں سائنس مخالف مکتب فکر کی سوچ اور موقف کا خلاصہ اور نچوڑ آ گیا تھا۔ اس کے بعد اس مکتب فکر کی فکری بنیادوں اور دلائل کو سمجھنا، ان کا تجزیہ کرنا اور اس مکتب فکر کی حمایت یا مخالفت اختیار کرنا آسان ہو گیا۔

سابقہ سطور میں ہم نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا مقصد صرف اور صرف ایک منفرد اور بظاہر اچھوتے دعویٰ (مفروضہ) کی جانچ اور تنقیح ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہم زیر بحث مکتب فکر کے دعویٰ میں اثابت، اصالت، راست فکری اور حکمت تلاش کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ ہم نے اپنی طالب علمانہ جانچ اور تنقیح کے نتیجے میں زیر بحث موقف کو غلو اور انحراف پر مبنی سمجھنے اور اس کی پرزور تردید کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پایا ہے۔ اسے ہماری کوتاہ فہمی اور خوش فہمی کہا جائے یا کم علمی کا نام دیا جائے بہرحال ہم دیانتداری سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری طرف سے پیش کیے جانے والے تجزیہ، محاکمہ اور دلائل کے بعد زیر بحث مکتب فکر کا دعویٰ/مفروضہ بے حقیقت ثابت ہوتا ہے۔ تاہم اس ایقان کے باوجود اگر مذکورہ مکتب فکر ہمارے اٹھائے گئے سوالات، اعتراضات اور دلائل کو عقلی و نقلی دلائل سے کمزور یا غلط ثابت کر دیتا ہے اور اپنے موقف کے حق میں ٹھوس عقلی و نقلی دلائل کی تفہیم اور ابلاغ میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ہمیں بے حد خوشی ہو گی۔ ہم نہ صرف ان کے شکر گزار ہوں گے بلکہ اپنے موقف سے رجوع کرنے میں ایک لمحہ کی تاخیر بھی نہیں کریں گے کیونکہ اپنے موقف کی فتح اور اس کی پیروی کے مقابلہ میں ہمیں سچائی اور حق کی فتح اور پیروی ہزار گنا زیادہ عزیز ہے۔ ہماری جان سے بھی زیادہ عزیز ہستی، رسول اکرم ﷺ نے ہمیں ہر گھڑی اور ہر لمحہ باطل سے اجتناب اور حق کی طرف بے تابانہ لپکنے کی تعلیم دی ہے لہٰذا جس لمحے ہم پر یہ ثابت ہو گیا کہ ہمارا موقف ناحق اور زیر بحث مکتب فکر کا موقف حق کے زیادہ قریب ہے تو ہم اسے تسلیم کرنے میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں کریں۔

آخر میں ہم یہ بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ بحث کے دوران ہمارا مقصود زیر بحث مکتب فکر کی غلطی، غلو اور منحرفانہ و سلبی سوچ کو واضح کرنا تھا، کسی کی دل شکنی یا اذیت قطعاً نہیں۔ لہٰذا استدعا ہے کہ بحث کے دوران اگر ہمارا کوئی لفظ یا جملہ زیر بحث مکتب فکر کے نمائندگان کے لیے دل شکنی یا اذیت کا باعث بنا ہو تو ہم پورے صمیم قلب سے اس پر معذرت طلب کرتے ہیں۔ (جاری ہے)

ڈاکٹر محمد امین کی بعض اہم تالیفات

اردو
۱۔ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل
۲۔ ہمارا دینی نظامِ تعلیم
۳۔ تعلیمی ادارے اور کردار سازی
۴۔ مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل
۵۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش
۶۔ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ)
۷۔ حقیقتِ تزکیۂ نفس
۸۔ ترکِ رذائل (اصلاح اعمال واخلاق کا حصہ اول)
۹۔ اسلام اور پاکستان
۱۰۔ اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی
۱۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون
۱۲۔ مقالاتِ امین (دو جلدیں)
۱۳۔ مطالعۂ قرآن وحدیث (برائے جماعت اول تا پنجم)

بروشرز
۱۴۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام
۱۵۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟
۱۶۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات
۱۷۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام
۱۸۔ مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ
۱۹۔ حقیقتِ تصوف

انگریزی
۲۰۔ Riyadh-us Saliheen (2 Vols)
۲۱۔ Noble Quran, Part 1
۲۲۔ Islamization of Laws in Pakistan

عربی
۲۳۔ السلطة التشريعية ـ دراسة مقارنة